لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

طاقت کا استعمال

قرآن کی روشنی میں



ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی اور ڈاکٹر فضل الرحمان فریدی کے مقالات پر

ایک تنقیدی نظر

رحمۃ اللہ علیہ
مولانا عبد العلیم اصلاحی

مکتبۃ الاقصی

لاکہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب وجگر



طاقت کا استعمال



قرآن کی روشنی میں



ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی اور ڈاکٹر فضل الرحمٰن فریدی

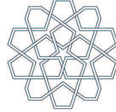
کے مقالات پر ایک تنقیدی نظر

(۲۰۰۵ء)



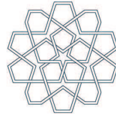
مولانا عبد العلیم اصلاحیؒ

فہرستِ مضامین





ہمت ہار جانا مومنانہ کردار نہیں ہے



ماہ نامہ ''زندگی نو'' مارچ ۲۰۰۴ء میں ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی صاحب کا مضمون ''تشدد اور مسلمان'' ہم نے پڑھا۔ یہ مضمون ڈاکٹر صاحب کی نئی کتاب ''اکیسویں صدی میں اسلام، مسلمان اور تحریک اسلامی'' میں ''تشدد، اسلام اور تحریک اسلامی'' کے نام سے شامل ہے۔ موصوف نے جو باتیں لکھی ہیں ان کیلئے ساری دنیا میں نہایت سازگار ماحول ہے لیکن ان کے خلاف لکھنے اور بولنے کیلئے فضا بالکل سازگار نہیں ہے۔ پھر بھی چند ضروری پہلوؤں پر تبادلۂ خیال کرنا فرض کا تقاضہ ہے۔

خلاصہ: ڈاکٹر صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یا ماحصل یہ ہے کہ فی زمانہ امریکہ چاہے اس کی کارروائیاں اور اقدامات کچھ بھی ہوں اور خواہ اس کی سنگینی جیسی کچھ بھی ہو اس کے خلاف قدم اٹھانا نہ تو جائز ہے اور نہ مسلمانوں کے حق میں مفید اور سودمند۔ اسی طرح ہندوستان میں ہندوتوا کے علمبردار کچھ بھی کر ڈالیں ان کا مقابلہ کرنے کے لئے جو قدم بھی قوت استعمال کرنے کے سلسلہ میں اٹھایا جائے گا وہ شرعی اعتبار سے غلط اور مسلمانوں کے لئے نقصان دہ اور مضر ہوگا۔

نا قابل قبول

ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں:

''مسلمانوں کیلئے سب کچھ برداشت کرنے کے سواء کوئی راہ نہیں ہے۔ یعنی ہاتھ اٹھانے اور ہاتھ استعمال کرنے کی گنجائش نہ شرعاً ہے اور نہ عقلاً۔ ہابیل نے قابیل کے مقابلہ میں جو رویہ اپنایا تھا وہی رویہ مسلمانوں کے لئے قابل تقلید نمونہ ہے۔'' (زندگیٔ نو، مارچ ۲۰۰۴ء)

ڈاکٹر صاحب کی یہ بات ایک لمحہ کیلئے بھی ایک عام مسلمان کے لئے نہ شرعاً قابل قبول ہو سکتی ہے اور نہ عقلاً۔ اس لئے کہ جانی اور مالی نقصان برداشت کرنا حتیٰ کہ گھر بار چھوڑنا، ترک وطن کرنا اور مع اہل وعیال اپنے کو حق کی خاطر قربان کرنے کا جواز ہی نہیں بلکہ اس کی حوصلہ افزائی اور اس کی ترغیب قرآن وحدیث کے نصوص اور

انبیائی تاریخ سے بآسانی ثابت کی جاسکتی ہے۔لیکن مار کھاتے رہنا اور نقصان اٹھاتے رہنا جس کی کوئی حد نہ ہو اور اپنی آئندہ نسلوں کو فتنہ کے حوالے کرنا اور فتنہ کو دفع نہ کرنا ایک ایسی بات ہے جس کو شرعی بنیادوں پر ثابت نہیں کیا جاسکتا اور اسے اللہ اور اس کے رسولؐ کی منشا نہیں قرار دیا جاسکتا۔ اگر کوئی فرد یا گروہ دشمنوں کے نرغے میں پھنس جائے اور اپنے بچاؤ کی کوئی صورت نہیں اختیار کرسکتا ہو تو یہ ایک الگ بات ہے۔لیکن اگر کچھ کرسکتا ہے تو اسے ضرور کرنا چاہئے ورنہ وہ خودکشی ہوگی جس کے لئے شریعت میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ دیکھئے اصحاب کہف غار میں کیوں چھپے! حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ہجرت کیوں کی؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام پوری قوم بنی اسرائیل کو رات کے سناٹے میں لے کر مصر سے کیوں نکلے؟ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کے کان اور آنکھ سے بچتے ہوئے بیعت عقبہ مدینہ کے لوگوں کے ساتھ کیوں کی اور اس سے پہلے کچھ صحابہ کرامؓ نے ہجرت حبشہ کیوں کی اور خود آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے وطن مالوف کو کیوں چھوڑا؟ ان سارے سوالوں کا جواب اس کے سواء کیا ہے کہ ان خدا رسیدہ بندوں نے اپنے بچاؤ کے لئے اپنے اپنے حالات کے لحاظ سے جو ممکن شکل ہوسکتی تھی اس کو اختیار کیا۔

ممکن ہے کہ اس موقع پر کوئی یہ کہے کہ اپنے بچاؤ کیلئے نہیں بلکہ دعوت کی بقاء اور توسیع کیلئے کیا تو اسے معلوم ہونا چاہئے کہ دعوت کی بقاء اور توسیع، داعی کی ذات کی بقاء کے ساتھ وابستہ ہے اور داعی کو منظر سے ہٹا دینے کے معنی دعوت کا خاتمہ ہے۔ غالباً یہی وہ راز ہے جو اللہ کے اس وعدہ میں پوشیدہ ہے کہ اللہ نے داعیٔ اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرمایا: "وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ" یعنی اللہ آپ کو لوگوں سے بچائے گا۔اس بات کی اہمیت کا یوں بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اللہ نے بنی اسرائیل کو فرعون کے ظلم وستم اور غلامی سے بچانے کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مبعوث فرمایا اور اس کو اتنی اہمیت دی کہ ان کی بعثت کے مقصد میں اس کو شامل کیا۔

قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَأَرْسِلْ مَعِيَ بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ (الاعراف:۱۰۵)

ترجمہ: میں تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک واضح دلیل لے کر آیا ہوں۔پس میرے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دو۔

فَأْتِيَاهُ فَقُولَآ إِنَّا رَسُولَا رَبِّكَ فَأَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ قَدْ جِئْنَاكَ بِأٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ وَالسَّلٰمُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى (طٰہٰ:۴۷)

ترجمہ: پس تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ پس اس سے کہو، ہم تیرے رب کے رسول ہیں۔ ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دو اور ان کو ستاؤ نہیں۔ہم تیرے پاس تیرے رب کی طرف سے ایک نشانی لے کر آئے ہیں۔ اور سلام اس پر جس نے ہدایت کی پیروی کی۔

اس میں شک نہیں کہ موجودہ حالات نہایت ہی سنگین ہیں اور صورتحال یہ ہے کہ غار اور کھوؤں میں چھپنا بھی بچاؤ کے لئے ممکن نہیں رہا۔ یہاں تک کہ چوہے کی طرح بل میں کوئی چھپا ہوتا ہے تو اس کو بھی پکڑ لیا جاتا ہے اور ایسے ایسے آلات ایجاد ہو چکے ہیں کہ تہہ خانوں کی اندرونی تصویر لے لی جاتی ہے اور بڑی طاقتوں نے ایسے بم بنا لئے ہیں کہ پہاڑ کے غاروں میں آدمی کی بو سونگھتے ہوئے پہنچ جاتے ہیں اور کام کر لیتے ہیں۔ کوئی کہاں چھپے اور اپنے کو کیسے بچائے؟! دنیا کے ایک سو اکتیس ملکوں میں امریکی فوج پھیلی ہوئی ہے اور سات سو پچیس فوجی اڈے مختلف علاقوں میں اس نے قائم کر رکھے ہیں اس طرح پوری دنیا امریکہ کی فوجی گرفت میں ہے اور زمین کے کسی خطے میں امریکہ کی مرضی کے خلاف کوئی چوں نہیں کر سکتا اور ساری قومیں دم سادھے بیٹھی ہیں۔ ان وجوہ کی بناء پر بہت زیادہ سوچنے والے اور بہت زیادہ تیز نگاہ رکھنے والے ڈاکٹر صاحب جیسے لوگ اس نتیجہ پر پہنچ رہے ہیں کہ اب امریکہ اور اس کے ایجنٹوں کے چنگل سے بچ نکلنے کی کوئی صورت نہیں ہے اور جو ہاتھ پیر مارے گا وہ خود اپنا ہاتھ پیر توڑ لے گا۔

یہ ایک ایسی صورتحال ہے جس کو ہر خاص و عام اپنی آنکھ سے دیکھ رہا ہے اور دل میں محسوس کر رہا ہے لیکن جن کی نگاہیں بہت تیز ہیں اور ذرائع معلومات جن کے پاس جتنے ہی زیادہ ہیں ان کی نظر میں یہ منظر اور بھی زیادہ بھیانک معلوم ہوتا ہے۔ واقعاتی دنیا میں اس بھیانک منظر کو پیش کرنا اور اس کا دنیا کو قائل بنانا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

لیکن اس بات کو ثابت کرنا بالخصوص شرعی اعتبار سے کہ مسلمانوں کو اس اژدھے کے سامنے سپر ڈال دینی چاہئے بہت مشکل ہے۔ اگرچہ کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے علم اور اپنی ذہانت کے بل پر کتاب وسنت اور اسلامی تاریخ سے ایسا مواد اکٹھا کرنے کی کوشش کی ہے جس سے ثابت ہو سکے کہ امریکہ جیسے اژدھے کے سامنے موجودہ حالات میں دم سادھے بیٹھے رہنے ہی میں دین و دنیا کی بھلائی ہے یعنی دنیاوی مصلحت کا بھی یہی تقاضہ ہے اور دین وشریعت کا بھی۔

ایک اہم پہلو

اس پس منظر میں ہم ڈاکٹر صاحب کے دلائل کا تفصیلی جائزہ لینا چاہتے ہیں مگر آگے بڑھنے سے پہلے ایک اور پہلو پر نظر ڈالئے تاریخ عالم ہمیں بتاتی ہے کہ جو قومیں زندہ رہنا چاہتی ہیں وہ کسی حال میں ہمت نہیں ہارتیں، حوصلوں کو پست نہیں ہونے دیتیں کہ زندگی نام ہے دراصل ہمت اور حوصلے کا۔ جس نے حوصلہ نہ ہارا وہ بالآخر کامیاب و کامران ہو کر رہا ہے۔ تاریخ میں کئی قومیں بہت سے نشیب و فراز سے گزرتی ہوئی دیکھی جا سکتی ہیں۔

قوموں کے عروج وزوال اور فتح وشکست کی کہانیوں سے تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں۔ان کہانیوں کے پیچھے کارفرما جوہر فکری بلندی، حوصلہ مندی اور عزم محکم ہوتا ہے یہ وہ چیز ہے جس کے سامنے بڑی سے بڑی فوجیں اور بھاری سے بھاری اسلحہ اور سامان جنگ ہوا ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں یہ ایک ایسی عام تاریخی حقیقت ہے جس کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن اپنے ماننے والوں کے اندر سب سے پہلے جو اذعان ویقین پیدا کرنا چاہتا ہے وہ یہ ہے۔

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ (آل عمران:١٣٩)

ترجمہ: ہمت نہ ہارو اور غم نہ کرو تم ہی بلند رہو گے اگر تم مومن ہو۔

فَلَا تَهِنُوا وَتَدْعُوا إِلَى السَّلْمِ وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ (سورۂ محمد:٣٥)

ترجمہ: پس تم بودے نہ بنو اور صلح کی درخواست نہ کرو تم ہی غالب رہنے والے ہو۔

وَكَأَيِّن مِّن نَّبِيٍّ قَاتَلَ مَعَهُ رِبِّيُّونَ كَثِيرٌ فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا وَاللهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ (آل عمران:١٤٦)

ترجمہ: اور بہت سے نبی ہیں جن کے ساتھ ہو کر بہت سے اللہ والوں نے جنگ کی ہے۔انہوں نے ہمت نہیں ہاری، اللہ کی راہ میں پیش آنے والے مصائب کی بناء پر وہ کمزور نہیں پڑے اور نہ درماندہ ہوئے اور اللہ صبر کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے۔

یعنی سربلندی اور سرفرازی کا دارومدار ایمان پر ہے ایمان کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ دنیا میں عروج وزوال، عزت اور ذلت اللہ کی طرف سے ملنے والی چیز ہے۔اللہ جسے عزت دینا چاہے اسے کوئی ذلیل نہیں کرسکتا اور جسے زوال کے کھڈ میں گرانے کا فیصلہ کرے اسے عروج وترقی سے کوئی ہمکنار نہیں کرسکتا۔اسی یقین کے مظاہر ہیں بدر واحد اور حنین کے معرکے، اور اُن تیز رفتار فتوحات کے سیلاب جن کو دیکھ کر دنیا آج تک حیرت زدہ ہے۔

اس یقین کو مزید تقویت دینے والے تاریخی شواہد کی طرف نظر اٹھانے کیلئے فرمایا گیا ہے:

كَم مِّن فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ (البقرة:٢٤٩)

ترجمہ: بہت سے چھوٹے گروہ اللہ کے حکم سے بڑے گروہ پر غالب ہوئے ہیں۔

ایمان ویقین کی یہ چنگاری سینوں میں موجود ہو اور اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے جدوجہد جاری رہے تو اللہ تعالیٰ مشکلات ومصائب کے بھنور سے اور غلامی سے نجات کی راہ پیدا کرتا ہے اور عروج وعزت کا سامان غیب

سے نمودار ہوتا ہے۔ مایوسی کی کوئی وجہ نہیں آج یہ کیوں سمجھا جا رہا ہے کہ عصر حاضر کی امریکہ جیسی سپر طاقتیں زیر نہیں ہو سکتیں۔

اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ (سورۂ یوسف:۸۷)

ترجمہ: بلاشبہ کافر لوگ ہی اللہ کی قدرت سے مایوس ہوتے ہیں۔

شایان شان بات

ڈاکٹر صاحب جیسی شخصیت کے حامل لوگوں کے شایان شان ہرگز یہ نہ تھا کہ بے بسی اور مجبوری کی حالت کو مسلمانوں کا مقدر بنا کر پیش کرتے جبکہ روئے زمین پر کم از کم ایک ارب دس کروڑ مسلمان ہیں اور خود ہندوستان میں بائیس کروڑ سے زائد اسلام کے نام لیوا پائے جاتے ہیں اور وسائل اور ذرائع کے طور پر ان کے پاس کیا چیز نہیں ہے؟! موجودہ دنیا کی سب سے ضروری چیز تیل کا خزانہ ان کے پاس ہے۔ اس طرح افرادی قوت کے ساتھ ساتھ دولت دنیا کی فراوانی بھی موجود ہے۔ جو کمی ہے وہ ہے حوصلہ کی، عزم کی، توکل علی اللہ کی اور ایمان و یقین کی۔ اگر ڈاکٹر صاحب مسلمانوں سے کہتے کہ مسلمانو! تم ہمت نہ ہارو اللہ پر بھروسہ کرو تم ایک فیصد نہیں بلکہ فی ہزار ایک کی نسبت سے قربانی دینے کیلئے تیار ہو جاؤ تو تمہارے سروں سے ذلت اور نکبت کے سارے بادل اور ساری گھٹائیں چھٹ جائیں گی تو یہ قرآن کی روشنی میں ایک صحیح اور بجا بات ہوتی۔

مضمون کا ایک تفصیلی جائزہ

ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

''تشدد اصلاً ایک غیر اخلاقی عمل ہے اخلاقی اصولوں پر کاربند مہذب سماجی زندگی میں تشدد کی اجازت صرف جرم کی سزاء کے طور پر'' تا کہ جرائم کا سدباب ہو سکے'' اور دفاع کے لئے دی جا سکتی ہے'' تا کہ خود کو دوسروں کے تشدد سے محفوظ رکھا جا سکے'' اس کے علاوہ کسی بھی حال میں تشدد کا استعمال ناروا ہے۔''

تشدد کسی حال میں بھی روا نہیں

ہمارے خیال میں تشدد کسی بھی حال میں روا نہیں ہے کسی جرم کی سزا کے طور پر یا دفاع کے لئے جو عمل کیا جاتا ہے اس کو تشدد کہنا مناسب نہیں ہے۔ تشدد تو ناحق اور بے جا زور اور طاقت استعمال کرنے کو کہتے ہیں جس کو ہر مہذب آدمی ناپسند کرتا ہے۔ جبکہ جرم پر سزا دینا اور اپنا دفاع کرنا صحیح اور حق ہمیشہ اور ہر جگہ قرار دیا جاتا رہا ہے۔ اخلاقی اور قانونی دونوں لحاظ سے جائز سمجھا گیا ہے۔ کسی جرم کی سزا کو بھی تشدد قرار دیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ساری دنیا ہمیشہ تشدد کی قائل رہی ہے اور ہمیشہ تشدد کا ارتکاب کرتی رہی ہے جو خلاف واقعہ اور غیر معقول بات ہے۔

تشدد کیا ہے؟

صحیح جگہ طاقت اور زور استعمال کرنے کو انسانی تاریخ میں نہ کبھی خراب سمجھا گیا ہے اور نہ آج خراب سمجھا جارہا ہے۔ بلکہ بجا اور ضروری سمجھا گیا ہے اور اس کی ستائش کی گئی ہے اور اسلام میں تو اس کو ایمان کی علامت بتایا گیا ہے۔

حدیث شریف میں ہے:

مَنْ رَأَى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهِ فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهِ فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهِ وَذَلِكَ أَضْعَفُ الإِيمَانِ۔ (رواہ مسلم)

ترجمہ: تم میں سے جو کوئی کسی برائی کو دیکھے۔ چاہئے کہ وہ اُسے اپنے ہاتھ سے بدل دے پس اگر اس کی استطاعت نہیں رکھتا تو چاہئے کہ اسے اپنی زبان سے بدلے اور اگر اس کی بھی طاقت نہ رکھتا ہو تو چاہئے کہ وہ اسے اپنے دل سے برا جانے اور یہ کمزور ترین ایمان ہے۔

وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخَرِينَ مِن دُونِهِمْ لَا تَعْلَمُونَهُمُ اللَّهُ يَعْلَمُهُمْ. (الانفال:٦٠)

ترجمہ: اور تم لوگ جہاں تک بس چلے زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے ان کے مقابلہ کیلئے تیار رکھو تاکہ اس کے ذریعہ اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو اور ان دوسرے دشمنوں کو خوف زدہ کردو جنہیں تم نہیں جانتے مگر اللہ انہیں جانتا ہے۔

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يَّآُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (البقرۃ:١٧٩)

ترجمہ: اور تمہارے لئے قصاص میں زندگی ہے اے عقل والو! تاکہ تم تقویٰ اختیار کرو۔

یعنی خون کا بدلہ خون ہے قاتل کو جرم قتل کی وجہ سے قتل کرنے کا جو قانون بنایا گیا ہے اس پر عمل کرنے میں لوگوں کی زندگیوں کی حفاظت ہے جو لوگ انسانی جان کا احترام نہ کرنے والوں کی جان کو بچانے کی کوشش کرتے ہیں وہ عقل و خرد کے خلاف عمل کرتے ہیں اور اپنی آستینوں میں سانپ پالنے کی بے وقوفی کرتے ہیں اور ایک قاتل کی جان بچا کر بہت سے بے گناہ انسانوں کی جانیں خطرے میں ڈالتے ہیں۔

جہاد تشدد نہیں

قرآن و حدیث کی روشنی میں جرم کی سزا کو تشدد کہنا نہایت غلط اور غیر اسلامی بات ہے درحقیقت مجرم کو جرم سے روکنے کیلئے جو سزا دی جاتی ہے وہ تشدد اور سختی نہیں ہے بلکہ سراسر نرمی اور باعث رحمت و برکت ہے۔ بہرصورت

تشدد کے جو بھی معنی ہوں ڈاکٹر صاحب کا تشدد کو صرف دو صورتوں میں منحصر بتانا بھی انتہائی غلط ہے اور دین حق کی آمد اور نبی کریم ﷺ کے مقصد بعثت پر کاری ضرب لگانے کے مترادف ہے۔ سورۂ توبہ آیت ۲۹ پر غور کیجئے۔

قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ (التوبۃ:۲۹)

ترجمہ: اور جنگ کرو ان لوگوں سے جو ایمان نہیں رکھتے اللہ پر اور نہ آخرت پر اور حرام قرار نہیں دیتے ہیں اس کو جس کو اللہ اور اس کے رسولؐ نے حرام قرار دیا ہے اور نہیں اختیار کرتے دین حق کو ان میں سے جنہیں کتاب دی گئی ہے یہاں تک کہ وہ جزیہ ادا کریں ہاتھ سے چھوٹے بن کر۔

اس آیت میں تین صفات رکھنے والوں سے جزیہ دینے تک جنگ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

(۱) اللہ اور آخرت پر یقین نہ رکھتے ہوں۔

(۲) اللہ اور اس کے رسولؐ کی حرام کردہ چیزوں کو حرام نہ مانتے ہوں۔

(۳) دین اسلام کو اختیار نہ کرتے ہوں۔

ان صفات کے حامل لوگوں سے جنگ اسی وقت بند ہوگی جبکہ وہ ذلیل بن کر رہنے اور جزیہ ادا کرنے کے لئے تیار ہو جائیں۔

"لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ" دین میں زبردستی نہیں ہے۔ یہ تسلیم شدہ چیز ہے لیکن اس کا تعلق صرف عقیدہ کو قبول کرنے اور نہ کرنے سے ہے۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ اہل کفر کو ان کے عقیدہ کے ساتھ زمین میں بالکل آزاد چھوڑ دیا جائے گا اور ان سے تعرض نہ کیا جائے گا۔ اگر ایسی بات ہو تو اللہ کا دین غالب ہونے کے لئے آیا ہے یہ بات کہنے کا کیا مطلب ہوگا؟

هُوَ الَّذِيٓ أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدٰى وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ. (الصّف:۹)

ترجمہ: وہ وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تا کہ وہ دین کو سب دینوں پر غالب کر دے خواہ مشرکین ناپسند کریں۔

پھر اس آیت کا کیا مطلب ہوگا اور ہاں فرضیت جہاد کے اندر کیا معنویت باقی رہے گی؟! نبی ﷺ کا معمول تھا کہ جب کسی مہم پر لشکر کو روانہ فرماتے تو کچھ ہدایات اور نصیحتیں فرماتے۔ ان میں یہ بات ہوتی کہ

کافروں سے اللہ کا نام لے کر جنگ کرو اور جنگ شروع کرنے سے پہلے ان کو اسلام کی دعوت دو اگر وہ قبول کریں تو فلاں فلاں حقوق و واجبات سے آگاہ کرو اور اگر دعوت قبول نہ کریں تو ان سے جزیہ کا مطالبہ کرو اور مسلمانوں کی ماتحتی قبول کرنے کو کہو اور اگر اس کے لئے بھی آمادہ نہ ہوں تو ان سے لڑو۔ یہی معمول خلفاء راشدین اور بعد کے خلفاء کا بھی تھا۔ پوری اسلامی تاریخ اس سے بھری پڑی ہے۔ مسلمانوں کی لشکر کشی کے واقعات مشہور و معروف ہیں آپ کہاں تک صفائی پیش کریں گے اور کہاں تک تاویل کریں گے!

اُمت مسلمہ کا فرض منصبی

جس طرح اسلام قبول کرنے کی دعوت دینا واجب اور فرض ہے اسی طرح ادیان باطلہ پر اسلام کو غالب کرنے اور اہل کفر و شرک کو ماتحت اور زیرنگیں بنانے کی جدوجہد کرنی بھی فرض ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو ذمہ داری شہادت حق اور اظہار دین کے عنوان سے مسلمانوں پر ڈالی ہے وہ صرف وعظ و نصیحت اور دعوت و تبلیغ سے ادا ہونے والی نہیں ہے ورنہ غزوات و سرایا کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ (الانفال:۳۹)

ترجمہ: ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ ختم ہوجائے اور دین پورے کا پورے اللہ کیلئے ہوجائے۔

دین کو غالب کرنے اور بدیوں کے سرچشموں کو بند کرنے کے لئے جہاد فرض کیا گیا ہے اسی کام کی اہمیت کے پیش نظر جہاد فی سبیل اللہ کے فضائل قرآن واحادیث میں بتائے گئے اور اسی لئے تمام کفار سے جنگ کرنے کا حکم صاف اور صریح لفظوں میں دیا گیا ہے۔

وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَافَّةً كَمَا يُقَاتِلُونَكُمْ كَافَّةً (التوبۃ:۳٦)

ترجمہ: تم سب مل کر مشرکین سے جنگ کرو جیسا کہ وہ سب ملکر تم سے جنگ کرتے ہیں۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ وَعَسٰى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسٰى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ

(البقرۃ:۲۱٦)

ترجمہ: تم پر جنگ فرض کردی گئی ہے اور وہ تمہارے لئے ناگوار ہے ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں ناگوار ہو اور وہ تمہارے لئے اچھی ہو اور ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند ہو اور وہ تمہارے لئے بری ہو۔ اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے۔

غلبۂ دین کا فریضہ خود یہ تقاضہ کرتا ہے کہ مسلمان دوسروں کے پہل کرنے کا انتظار نہ کریں وہ خود پہل کریں اسی بات کو فقہ میں یوں کہا گیا ہے۔

قتال الکفار واجب وان لم یبدأونا

ترجمہ: کفار سے جنگ واجب ہے چاہے وہ ہمارے ساتھ پہل نہ کریں۔

تعجب ہے جو لوگ غلبۂ دین اور اقامت دین کو سب سے بڑا دینی فریضہ قرار دیتے ہیں ان کی حلق کے نیچے یہ بات نہیں جاتی اور قرآن کی صاف اور صریح آیات اور احادیث شریفہ کی تاویل کرتے ہیں اور سرے سے قرآن وسنت سے ثابت شدہ فریضہ کا انکار کرتے ہیں اگر وہ یہ کہتے کہ یہ سب تسلیم ہے۔لیکن ہمارے اندر اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے استطاعت نہیں ہے تو کسی قدر معقول بات ہوسکتی تھی لیکن یہ لوگ جہاد، کو دفاع کو اور دشمن سے انتقام لینے ہی کو متنازعہ فیہ مسئلہ بنا کر پیش کرتے ہیں اور پھر عدم جواز پر دلائل لانے کی کوشش کرتے ہیں اس طرز فکر وعمل کو نہ معقول کہا جاسکتا ہے اور نہ جائز۔

اس مسئلہ کو یوں سمجھئے کہ ایک شخص بیمار اور کمزور ہے پانی استعمال کرنے کی سکت نہیں رکھتا تو اس کے لئے معقول طریقہ یہ ہے کہ وہ تیمم کے لئے اپنی بیماری اور معذوری کو وجہ بتائے۔لیکن اگر وہ حکم وضو ہی کو متنازعہ فیہ بنانے کی کوشش کرے اور کہے کہ صاحب وضو کا مکی آیات میں کہیں ذکر نہیں ملتا۔مکہ میں ۱۳ سال تک مسلمان وضو کیسے کرتے تھے۔ان کی تفاصیل ہمیں کہیں نہیں ملتیں۔اس لئے حالات کے تناظر میں بہت کچھ گنجائش ہے وضو وضو کی رٹ نہ لگاؤ۔

غلط طرز استدلال

الغرض ڈاکٹر صاحب نے دشمنان دین وملت سے نمٹنے کے مسئلہ پر جس طرح بحث کی ہے اس طرز استدلال کی رو سے دین کا کوئی فریضہ بھی اپنی اصل صورت میں باقی نہیں رہ سکتا۔حتیٰ کہ نماز بھی اپنی اصل شکل میں محفوظ نہیں رہ سکتی۔کیونکہ نماز کی موجودہ شکل شروع میں نہیں تھی کئی مرحلوں سے گزرتے ہوئے نماز اس شکل میں پہنچی ہے تو کیا ابتدائی اور درمیانی شکلوں کو زیر بحث لا کر نماز کو کوئی شخص متنازعہ فیہ بنانے کی کوشش کرے تو اس کو معقول و جائز کہا جاسکتا ہے!؟ نبی ﷺ اور آپؐ کے اصحابؓ نے ۱۳ سال تک جمعہ نہیں پڑھا۔اذان اور اقامت نہیں کہی۔باجماعت نماز کا اہتمام نہیں کیا۔کعبۃ اللہ کو ۱۴ سال تک قبلہ نہیں بنایا۔طویل عرصہ تک نماز میں سلام اور کلام سب چلتا تھا۔۱۳ سال تک شراب اور سود حلال سمجھے گئے۔

اگر کوئی سوال کرے آخر ان سب چیزوں کی گنجائش کیوں ختم ہوگئی جبکہ ہم بھی اسی طرح کمزور اور غیروں کے تحت ہیں جس طرح مکہ میں مسلمان تھے جب یہ سب گنجائشیں ان کے لئے تھیں تو ہمارے لئے کیوں نہیں ہیں؟؟

ڈاکٹر صاحب اس سوال کا جو جواب دیں گے وہی جواب ہمارا بھی ہوگا۔ اس سوال کے جواب میں جوانہوں نے آج مسلمانوں کی کمزوری اور اقتدار سے محرومی کے حوالے سے دفاعی ذمہ داریوں کے ضمن میں اٹھایا ہے۔

ایک بے موقع بات

ایک ذیلی ہیڈنگ ''تشدد اور اخلاق'' کے تحت ڈاکٹر صاحب نے یہ بتانے کی کوشش فرمائی ہے کہ اسلام تشدد کا نہیں اخلاق کا مظہر ہے۔ اسلام رحمت، شفقت، رواداری، نرم روی اور عفو و درگذر پر مبنی دین ہے۔ اس کی دلیل میں کئی آیات قرآنی اور احادیث درج کی ہیں۔ اگرچہ کہ قدرے سختی کا بھی اعتراف کیا ہے لیکن ''خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ'' جیسی آیات پیش کر کے تشدد کی تقریباً نفی کی ہے اور نرم روی کو دین کی اصل بتایا ہے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس وقت پوری روئے زمین پر امریکہ اور اس کے حلیفوں کی چیرہ دستیوں اور سفاکیوں کا افغانستان، عراق اور فلسطین میں جو منظر ساری دنیا نے دیکھا ہے اور ہندوتوا کا نعرہ لگانے والوں نے جو کارنامے گجرات میں انجام دیئے ہیں اس پس منظر میں مسلمانوں کو اخلاق کا سبق پڑھانے کا کونسا موقع تھا؟!

جبکہ اس آسمان کے نیچے اور زمین پر بے در اور بے گھر ہو کر کیمپوں میں زندگی گذارنے والوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ جیلوں میں انسانیت سوز اذیتوں کا سامنا کرنیوالے اکثر مسلمان ہیں۔ لاپتہ ہونے والوں میں مسلمانوں کے نام سرفہرست ہیں۔ اپنی جنم بھومی سے بے دخل کئے جانے والوں کا سروے کیا جائے تو مسلمان سب سے زیادہ ملیں گے۔ حقوق انسانی کی پامالی کا اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس ستم کا شکار ہونے والے بڑی تعداد میں مسلمان ہیں۔ اجتماعی طور پر عورتوں کی عصمت دری آج کی مہذب دنیا میں اگر کہیں کی گئی ہے تو وہ مسلمان عورتیں ہیں، زندہ آباد بستیوں پر بلڈوزر چلائے جانے کی اگر تاریخ لکھی جائے تو آپ دیکھیں گے کہ وہ مسلمانوں کی آبادیاں ہیں۔ خواتین کے پیٹ چاک کرنے کے واقعات کی لسٹ بنائی جائے تو اس لسٹ میں خالدہ اور ناصرہ جیسے نام نظر آئیں گے۔ آخر وہ وقت کب آئے گا جب ہمارے پتھر دل نرم ہوں گے اور امت مسلمہ کی مظلومیت کی کسک محسوس کریں گے! کیا اس وعظ کی مثال بالکل ایسے ہی نہیں ہے جیسے ڈاکوؤں کی ایک مسلح ٹولی کسی غریب کے گھر پر دھاوا بول رہی ہو اور گھر کے نہتے مکینوں کی جان کے لالے پڑے ہوں اور آپ ڈاکوؤں کو روکنے کی کوئی تدبیر اختیار کرنے یا ان کو سرزنش اور فہمائش کرنے کے بجائے گھر والوں کے سامنے عفو درگذر کے عنوان پر وعظ فرمانے لگیں۔

افراط وتفریط کی مثال

اور وہ بھی ایسا وعظ جو افراط وتفریط پر مبنی ہو اور صحیح اسلامی فکر اور اسپرٹ کے خلاف ہو۔ اسلام نے جہاں یہ کہا کہ جس نفس کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے اسے قتل نہ کرو۔ وہاں پر ''اِلَّا بِالْحَقِّ'' کی قید لگائی ہے۔ اسی طرح جہاں یہ کہا گیا کہ جس نے ایک جان کو قتل کیا وہاں ''بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ'' کا استثنیٰ بھی کر دیا اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ نہیں کہا گیا کہ کسی جان کو کسی حال میں بھی قتل نہ کرو۔ اگر ایسا کہا جاتا تو یہ تعلیم کا نقص ہوتا، عدل نہ ہوتا، بلکہ ظلم کے ہم معنی ہوتا۔ یہ نقص کسی انسانی تعلیم اور قانون میں تو ہوسکتا ہے مگر خدائی قانون میں اس طرح کے نقص کا ہونا ناممکن تھا۔ اسی لئے صاف طریقے سے بتا دیا گیا کہ انسانی خون کی حرمت اسی وقت تک ہے جب تک اس پر حق نہ قائم ہوجائے یعنی کسی کو زندہ رہنے کا حق صرف اس کی جائز حدود کے اندر دیا جاسکتا ہے۔ مگر جب وہ ان حدود سے تجاوز کر کے فتنہ وفساد پھیلائے یا دوسروں کی جان پر ناحق حملہ کرے تو وہ اپنے زندہ رہنے کے حق کو خود بخود کھودیتا ہے اور اس کے خون کی حرمت زائل ہوکر حلت سے بدل جاتی ہے اور پھر اس کی موت ہی انسانیت کی حیات کی ضامن ہوتی ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا ''اَلْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ'' یعنی قتل بری چیز ہے مگر اس سے زیادہ بری چیز فتنہ وفساد ہے جب کوئی شخص اس بڑے جرم کا مرتکب ہو تو اس کی اس بڑی برائی کا خاتمہ کر دینا ہی زیادہ بہتر ہے۔ اسی حقیقت کو اس دور کے ایک بڑے مفکر اور تحریک اسلامی کے داعی سید مودودیؒ نے نہایت ہی جامع مانع اور مختصر لفظوں میں یوں پیش کیا ہے۔

> ''قتل بغیر حق کی ایسی سخت ممانعت اور قتل بالحق کی ایسی سخت تاکید کر کے شریعت الٰہیہ نے افراط وتفریط کی دو راہوں کے درمیان عدل وتوسط کی سیدھی راہ کی طرف ہماری رہنمائی کی ہے۔''

''خُذِ الْعَفْوَ (الاعراف:۱۹۹)، لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (البقرہ:۲۵۶) اور لَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ (حم السجدہ:۳۴،۳۵) کے ساتھ ساتھ سورۃ التوبہ آیت ۷۳، سورۃ الانفال آیت ۶۵، سورۂ محمد آیت ۴ کو بھی نظر میں اگر رکھا جاتا تو مناسب ہوتا۔ کسی مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے کسی ایک رخ پر بہہ جانا اور اس کے خلاف رخ کو بالکل نظر انداز کر دینا، کوئی علمی انداز بحث نہیں ہے۔ اگر ڈاکٹر صاحب علمی طریقہ اختیار فرماتے تو ہرگز یکطرفہ بات نہ کرتے اور افراط و تفریط سے بچ جاتے اور انہیں کہنا پڑتا کہ اسلام میں جہاں نرم روی ہے وہیں سخت گیری بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ جیسے غفور رحیم ہے ویسے ہی شَدِيْدُ الْعِقَابِ اور شَدِيْدُ الْعَذَابِ بھی ہے اور اللہ کے بندے اگر رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ ہیں تو اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ بھی ہیں۔ حسب ذیل آیات پر غور کیجئے ان سے ڈاکٹر صاحب کے خیالات کی ژولیدگی اور حقیقت سے دوری کھل کر سامنے آجائے گی۔

يَآأَيُّهَا النَّبِيُّ جٰهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ وَمَأْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ (التوبۃ:۷۳)

ترجمہ: اے نبی ﷺ کفار اور منافقین دونوں سے جہاد کرو اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آؤ ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بدترین جائے قرار ہے۔

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (الانفال:٦٧)

ترجمہ: کسی نبی کیلئے یہ زیب نہیں ہے کہ اس کے پاس قیدی ہوں۔ جب تک کہ وہ زمین میں دشمنوں کو اچھی طرح کچل نہ دے تم لوگ دنیا کے فائدے چاہتے ہو اور اللہ کے پیش نظر آخرت ہے اور اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔

فَإِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتّٰى إِذَا أَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَآءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ أَوْزَارَهَا. (سورۂ محمد:۴)

ترجمہ: پس جب ان کافروں سے مڈبھیڑ ہو تمہاری تو پہلا کام گردنیں مارنا ہے یہاں تک کہ جب تم ان کو اچھی طرح کچل دو۔ تب قیدیوں کو مضبوط باندھو۔ اس کے بعد احسان کرو یا فدیہ کا معاملہ کرو تا آنکہ لڑائی اپنا ہتھیار ڈال دے۔

ان آیات میں دین کا جو پہلو اجاگر کیا گیا ہے اس کو نظر انداز کر دینے کے لئے کون سی چیز لوگوں کو آمادہ کر دے رہی ہے خدا ہی کو معلوم ہے!

گمراہی کی بات

ایک پُرفریب ذیلی ہیڈنگ ''قتال کی اجازت'' کے ذیل میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں صحت اور اعتدال کی راہ چھوٹ گئی ہے بلکہ زبردست گمراہی کی بات کہی گئی ہے۔ یہ ہیڈنگ لگا کر یہ تاثر دیا جارہا ہے کہ اصل تو یہ ہابیل کا نمونہ ہے جس پر عمل ہونا چاہئے مگر قتال کی اجازت بھی ہے۔ اجازت کا مطلب ہے کرو یا نہ کرو تمہیں اختیار ہے نا کرنے پر کوئی مؤاخذہ نہیں ہوگا۔ حالانکہ قتال فرض ہے اور ترک فرض پر گرفت اور مواخذہ ضرور ہوگا ورنہ فرض کے کوئی معنی نہ رہ جائیں گے۔ یہ فرضیت صیغۂ امر ''قَاتِلُوْا'' کے ذریعہ بھی ثابت ہوتی ہے اور دوسرے طریقہ سے بھی جیسا کہ قرآن میں ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ وَعَسَى أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسَى أَنْ تُحِبُّوا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ.
(البقرة:۲۱۶)

ترجمہ: تم پر جنگ فرض کی گئی اور وہ تمہارے لئے ناپسندیدہ ہے اور ہوسکتا ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور وہ تمہارے لئے بہتر ہو اور ہوسکتا ہے کہ کوئی چیز تم کو پسند ہو اور وہ تمہارے لئے بری ہو اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

حدیث میں ہے:

امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا لا الہ الا اللّٰہ فاذا قالوھا عصموا منی دمائھم واموالھم الا بحقھا وحسابھم علی اللّٰہ تعالٰی (مسلم)

ترجمہ: مجھے حکم دیا گیا کہ میں لوگوں سے جنگ کروں یہاں تک کہ وہ لا الہ الا اللہ کہہ دیں۔ پس جب وہ اس کو کہیں گے تو مجھ سے اپنے خون اور اپنے مال کو بچا لیں گے مگر ان کے حق کے ساتھ اور ان کا حساب اللہ تعالیٰ پر ہے۔

فقہ میں ہے:

اعلم ان جهاد الكفار فی بلادهم فرض كفاية باتفاق العلماء

ترجمہ: جان لو بلاشبہ کفار سے جہاد ان کے ملکوں میں فرض کفایہ ہے باتفاق علماء

وحكی عن ابن المسيب وابن شبرمة أنه فرض عين

ترجمہ: اور ابن المسیّب اور ابن شبرمہ سے حکایت ہے کہ جہاد فرض عین ہے۔

ومعنى فرض الكفاية انه اذا قام به من فيه كفاية سقط الحرج والاثم عن الباقين فان ترك الجميع اثموا۔ (مشارق الاشواق، جلد اول، ص:۹۸)

ترجمہ: اور فرض کفایہ کے معنی یہ ہیں کہ جب اس کو اتنے لوگ انجام دیں جو کافی ہوں تو جرم اور گناہ بقیہ لوگوں سے ساقط ہو جائیگا اور اگر سب لوگ جہاد چھوڑ دیں تو سب کے سب گنہگار ہوں گے۔

ایمان کی کسوٹی

جہاد سے جی چرانے والوں کے لئے دنیا اور آخرت دونوں جہاں میں برے انجام کی وعیدیں سنائی گئی ہیں۔ آخرت میں جہنم اور دنیا میں ذلت اور نکبت کی خبر دی گئی ہے۔ جہاد کو ایمان کی کسوٹی بتایا ہے۔ گویا جہاد اور جذبۂ جہاد کے بغیر ایمان کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ أُولٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ (الحجرات:۱۵)

ترجمہ: حقیقت میں تو مومن وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائیں پھر انہوں نے کوئی شک نہ کیا اور اپنی جانوں اور مالوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا وہی سچے لوگ ہیں۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

ومن مات ولم يغز ولم يحدث نفسه بالغزو مات على شعبة من النفاق۔ (رواہ مسلم)

ترجمہ: اور جو شخص مرجائے اور اس نے جنگ نہ کی ہو اور نہ اپنے دل میں جنگ کے متعلق سوچا ہو تو وہ نفاق کے شعبہ پر مرا۔

اسی کے ساتھ نہایت ہی اہم بات یہ ہے کہ جہاد کے مقاصد میں سب سے اہم مقصد اہل باطل اور اعداء دین کی قوتوں کو توڑ کر اسلام کو غالب کرنا اور اللہ کے کلمے کو بلند کرنا ہے۔

حضرت ابوموسیٰؓ اشعری کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا گیا کہ اللہ کے راستے میں جنگ کون کرتا ہے تو آپ نے فرمایا:

هو من قاتل لتكون كلمة الله هي العليا ولا يقاتل رياء ولا سمعة

ترجمہ: وہ وہ ہے جس نے جنگ کیا تا کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو اور دکھاوے اور شہرت کیلئے نہ لڑتا ہو۔

یعنی فی سبیل اللہ جنگ اس کی ہوگی جو اس لئے لڑے کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو، دکھاوے اور شہرت کے لئے نہ لڑے۔ جہاد کو محض جائز قرار دینے سے اس مقصد کی نفی ہو رہی تھی لیکن دبے لفظوں میں ہو رہی تھی۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب نے صاف صاف لفظوں میں اس کو یوں ظاہر کر دیا۔

اسلام کی عام پالیسی

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا:

''ایک عام پالیسی کے طور پر اسلام کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ وہ تشدد کا جواب تشدد سے دینے کی ہمت افزائی کرے بلکہ وہ اسے بہتر سمجھتا ہے کہ آئندہ تشدد کے سدباب کی تدابیر اختیار کی جائیں اور جو کچھ ہو گیا اس کے سلسلہ میں عفو و درگذر سے کام لیا جائے۔''

اب دیکھئے قرآن کیا کہتا ہے:

وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا إِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ. (البقرۃ:۱۹۰)

ترجمہ: اور جنگ کرو اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جو تم سے جنگ کرتے ہیں اور زیادتی نہ کرو۔ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْہِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ وَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاعْلَمُوْا أَنَّ اللّٰہَ مَعَ الْمُتَّقِیْنَ. (البقرۃ:۱۹۴)

ترجمہ: پس تم پر جو دست درازی کرے تم بھی اسی طرح اس پر دست درازی کرو اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ اللہ متقیوں کے ساتھ ہے۔

وَقَاتِلُوا الْمُشْرِکِیْنَ کَآفَّۃً کَمَا یُقَاتِلُوْنَکُمْ کَآفَّۃً. (التوبۃ:۳۶)

ترجمہ: اور مشرکوں سے تم سب مل کر لڑو جیسا کہ وہ سب مل کر تم سے لڑتے ہیں۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَا لَکُمْ إِذَا قِیْلَ لَکُمُ انْفِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اثَّاقَلْتُمْ إِلَی الْاَرْضِ...اِلَّا تَنْفِرُوْا یُعَذِّبْکُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا وَّیَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ.
(التوبۃ:۳۸-۳۹)

ترجمہ: اے ایمان والو! تمہیں کیا ہو گیا ہے جب تم سے اللہ کی راہ میں نکلنے کے لئے کہا گیا تم زمین سے چمٹ کر رہ گئے.... اگر تم نہ نکلو گے تو خدا تمہیں دردناک عذاب دے گا اور تمہارے علاوہ کسی دوسری قوم کو لا دے گا۔

وَمَا لَکُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَالْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ ھٰذِہِ الْقَرْیَۃِ الظَّالِمِ اَھْلُھَا.
(النساء:۷۵)

ترجمہ: اور تمہیں کیا ہو گیا کہ تم اللہ کی راہ میں ان بے بس مردوں اور عورتوں اور بچوں کی خاطر نہیں لڑتے جو کمزور پا کر دبا دیئے گئے ہیں اور فریاد کر رہے ہیں کہ خدایا ہمیں اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں۔

ان آیات میں جنگ کا حکم بھی ہے اور ترغیب بھی۔ نیز جنگ سے جی چرانے والوں کی سرزنش کی گئی ہے۔ اسی کے ساتھ قرآن میں جنگ میں جان کی بازی لگانے والوں کے لئے مغفرت کی اور جنت کی اور فتح و کامرانی

کی خوشخبری دی گئی ہے۔ جنگ میں مرنے والوں کو مردہ کہنے سے منع کیا گیا انہیں کو حقیقی زندگی حاصل ہے بتایا گیا۔ جہاد وقتال کو فرض بتایا گیا اور کہا گیا ہے کہ بظاہر ناپسندیدہ ہے لیکن حقیقت میں وہ تمہارے لئے باعث خیر ہے۔ جنگ میں مرنے والوں کے درجات علیا اور اجر وثواب کا ذکر جس انداز میں اور جس کثرت سے کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی نیکی نہیں ہے۔ ان باتوں کے ہوتے ہوئے یہ کہنا کہاں تک صحیح ہوسکتا ہے کہ تشدد کا جواب تشدد سے دینے کی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی بات بالکل ایسی ہے کہ کوئی دانشور بھری مجلس میں پورے زور سے کہے کہ قرآن میں جہاد وقتال کا لفظ نہیں آیا ہے اور جنگ بدر وحنین اور جنگ احد اور خندق نام کا کوئی معرکہ کبھی پیش نہیں آیا ہے۔

جہاد وقتال سے متعلق درجنوں آیات قرآنی، سینکڑوں فقہی اوراق کتب اور ہزاروں صفحات پر مشتمل اسلامی تاریخ کو نظر انداز کرتے ہوئے قرآن کے دو مقامات کو اپنی بات کی تائید میں ڈاکٹر صاحب نے پیش کیا ہے۔ آیئے ان پر غور کریں۔

قرآن کے دو مقامات پر غور

موصوف نے سورۂ شوریٰ آیات ۴۰ تا ۴۳ پر غور کرنے کی دعوت دی۔ حالانکہ ۳۷ تا ۴۳ آیات پر غور کرنا چاہئے۔ اس لئے کہ ایک گروپ یا یہ کہا جائے کہ ایک مضمون کی یہ آیات ہیں۔ اس گروپ کی ۳۹ نمبر ویں آیت پر پہلے مولانا مودودیؒ کا نوٹ پڑھئے:

> ''یہ بھی اہل ایمان کی بہترین صفات سے ہے وہ ظالموں اور جباروں کے لئے نرم چارہ نہیں ہوتے ان کی نرم خوئی اور عفو ودرگذر کی عادت کمزوری کی بناء پر نہیں ہوتی۔ انہیں بھکشوؤں اور راہبوں کی طرح مسکین بن کر رہنا نہیں سکھایا گیا ہے۔ ان کی شرافت کا تقاضہ یہ ہے کہ جب غالب ہوں تو مغلوب کے قصور معاف کردیں۔ جب قادر ہوں تو بدلہ لینے سے درگزر کریں اور کسی زیردست یا کمزور آدمی سے کوئی خطا سرزد ہوجائے تو اس سے چشم پوشی کر جائیں لیکن جب کوئی طاقتور اپنی طاقت کے زعم میں ان پر دست درازی کرے تو ڈٹ کر کھڑے ہوجائیں اور اس کے دانت کھٹے کردیں۔ مومن کبھی ظالم سے نہیں دبتا اور منکر کے آگے نہیں جھکتا۔ اس قسم کے لوگوں کے لئے وہ لوہے کا چنا ہوتا ہے جسے چبانے کی کوشش کرنے والا اپنا ہی جبڑا توڑ لے گا۔''

ظاہر ہے آیت نمبر ۳۹ ڈاکٹر صاحب کے مدعا کے خلاف ہے غالباً اسی بناء پر اس پر غور کرنے کی دعوت نہیں دی یا اس لئے کہ وہ اپنے مفہوم میں واضح ہے جو کچھ بھی ہو۔ آیئے ان آیات پر غور کریں۔

ایک تفسیری اشکال

ان سات آیات میں غور طلب بات یہ ہے کہ ایک جگہ "هُمۡ يَغۡفِرُوۡنَ" یعنی وہ معاف کرتے ہیں۔ دوسری جگہ "اِذَاۤ اَصَابَهُمُ الۡبَغۡىُ هُمۡ يَنۡتَصِرُوۡنَ" یعنی جب ان کے ساتھ زیادتی کی جاتی ہے تو وہ مقابلہ کرتے ہیں۔ تیسری جگہ "فَمَنۡ عَفَا وَاَصۡلَحَ فَاَجۡرُهٗ عَلَى اللّٰهِ" کہا گیا۔ یعنی پس جو معاف کرے اور اصلاح کرے اس کا اجر اللہ پر ہے۔

سوال یہ ہے کہ ان باتوں میں باہمی ربط اور تعلق کیا ہے۔ بظاہر دو متضاد صفتوں کا حامل مسلمانوں کو بتایا ہے۔ ایک طرف کہا جا رہا ہے کہ مسلمانوں کے اندر معاف کرنے کی صفت پائی جاتی ہے اور دوسری طرف یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ وہ مقابلہ کرتے ہیں اور انتقام لیتے ہیں۔ یہ کیا بات ہوئی؟! اس اشکال کو مختلف مفسرین نے رفع کرنے کی کوشش کی ہے۔

صاحب روح المعانیؒ کا جواب

صاحب روح المعانیؒ نے کہا:

> ''کئی لوگوں نے کہا ہے ہر صفت کے ظاہر ہونے کا ایک موقع ہے جس میں وہ قابل تعریف ہوتی ہے پس درگزر کی صفت اس وقت قابل تعریف اور محمود ہوتی ہے جب معافی اور درگزر ایسے شخص سے کیا جائے جو کمزور ہو اور اسے اپنے جرم کا اعتراف ہو۔ لفظ "يَغۡفِرُوۡنَ" سے اس کی طرف اشارہ ہو رہا ہے اور انتقام اور مقابلہ اس وقت محمود ہوتا ہے جب سامنے والا دشمنی اور مخاصمت پر اصرار کر رہا ہو اور لفظ "يَنۡتَصِرُوۡنَ" اس کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ اگر اس کے برعکس درگزر اور انتقام کا عمل کیا جائے تو دونوں مذموم ہیں۔''

اس مفہوم کو واضح کرنے کے لئے علامہ نے عربی کے دو شعر پیش کئے ہیں جس کا مفہوم یہ ہے کہ جب تم کسی شریف کی عزت کرو گے تو وہ تمہارا گرویدہ ہو جائے گا اور جب کسی کمینہ کا اکرام کرو گے تو وہ اپنی کمینگی میں اور بڑھ جائے گا۔ تلوار کی جگہ شبنم اور شبنم کی جگہ تلوار رکھنا مضر ہے۔

امام رازیؒ کا جواب

امام رازیؒ نے اس شبہ کو یوں دور کیا ہے:

> ''عفو و درگزر کی دو قسمیں ہیں ایک عفو درگزر وہ ہے جس سے فتنہ دب جائے اور جو مجرم کے لئے سزا ثابت ہو اور وہ اپنے جرم سے باز آ جائے۔ دوسرا عفو و درگزر وہ ہے جس سے مجرم کی جرأت میں اضافہ ہو جائے اور اس کے غیظ و غضب کو شہ ملے۔ عفو و درگزر سے متعلق آیات میں پہلی قسم کے درگزر کی تعریف کی گئی اور اس کو

مسلمانوں کی صفت بتائی گئی ہے اور جہاں عفو درگزر سے جرم پر جرأت بڑھ جانے کا امکان ہو وہاں عفو درگزر کے بجائے مومنانہ صفت انتقام لینے کو بتایا گیا ہے۔''

مفتی شفیعؒ کا جواب

اس کی مزید وضاحت کے لئے تفسیر معارف القرآن کے یہ الفاظ پڑھئے:

''حضرت ابراہیم نخعیؒ نے فرمایا کہ سلف صالحین یہ پسند نہ کرتے تھے کہ مومنین اپنے آپ کو فساق و فجار کے سامنے ذلیل کریں اور ان کی جرأت بڑھ جائے۔ اس لئے جہاں یہ خطرہ ہو کہ معاف کرنے سے فساق و فجار کی جرأت بڑھے گی وہ اور نیک لوگوں کو ستائیں گے وہاں انتقام لے لینا بہتر ہوگا اور معافی کا افضل ہونا اس صورت میں ہے جبکہ ظلم کرنے والا اپنے فعل پر نادم ہو اور ظلم پر اس کی جرأت بڑھ جانے کا خطرہ نہ ہو۔ قاضی ابوبکر ابن عربیؒ نے احکام القرآن میں اور قرطبیؒ نے اپنی تفسیر میں اسی کو اختیار کیا ہے کہ عفو و انتقام کے دونوں حکم مختلف حالات کے اعتبار سے ہیں جو ظلم کرنے کے بعد شرمندہ ہو جائے اس سے عفو افضل ہے اور جو اپنی ضد اور ظلم پر اصرار کر رہا ہو اس سے انتقام لینا افضل ہے۔''

مولانا امین احسن اصلاحیؒ کا جواب

مولانا امین احسن اصلاحیؒ صاحب نے آیت ۴۱ کے فقرہ ''وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ'' پر مندرجہ ذیل نوٹ لکھا ہے:

''یہ ان لوگوں کے شبہ کا جواب ہے جو دینداری کا ایک تقاضا یہ بھی سمجھتے ہیں کہ آدمی دوسروں کے ہاتھوں پٹتا رہے اور ان سے کوئی انتقام نہ لے اگر کوئی انتقام لے تو یہ چیز دینداری کے خلاف سمجھی جاتی ہے اور اس کو بھی برابر کا مجرم سمجھ لیا جاتا ہے۔ فرمایا کہ اس طرح کے معاملات میں الزام ان لوگوں پر نہیں ہے جنہوں نے اپنے اوپر ظلم کئے جانے کے بعد انتقام لیا بلکہ الزام ان لوگوں پر ہے جو دوسروں پر ظلم کرتے ہیں اور بلا کسی استحقاق کے خدا کی زمین پر سرکشی اور طغیان کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔''

دوسرا اشکال

اس موقع پر ڈاکٹر صاحب نے حضرت آدم علیہ السلام کے ایک بیٹے ہابیل کے رویہ کو بھی پیش کیا ہے جس نے قابیل سے کہا تھا تم اگرچہ مجھے قتل کرنا چاہتے ہو لیکن میں تمہیں قتل کرنے کے لئے ہاتھ نہ اٹھاؤں گا۔ ''مَآ اَنَا بِبَاسِطٍ یَّدِیَ اِلَیْكَ لِاَقْتُلَكَ''۔

یہاں بھی ایک اشکال ہے اشکال کی وجہ یہ ہے کہ شریعتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم میں دفاع کی وہ حیثیت نہیں ہے جو

شریعت عیسوی میں تھی جیسا کہ مشہور ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول ہے جو تمہارے ایک گال پر مارے اسے تم اپنا دوسرا گال بھی پیش کردو۔ اس کے برخلاف حضرت ابوھریرہؓ کی روایت ہے کہ ایک آدمی آیا اور کہا۔ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ کا کیا خیال ہے ایک شخص آتا ہے اور میرا مال چھین لینا چاہتا ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم اس کو اپنا مال نہ دو۔ پھر اس آدمی نے کہا اگر وہ مجھ سے جنگ کرلے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم اس سے جنگ کرو۔ اس آدمی نے کہا۔ آپ کا کیا خیال ہے اگر وہ مجھے قتل کردے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تم شہید ہوگئے۔ پھر اس آدمی نے پوچھا آپ کا کیا خیال ہے اگر میں اس کو قتل کردوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: وہ دوزخ میں جائے گا۔ (الجنایات۔مشکوۃ)

مشہور حدیث

مَنْ قُتِلَ دُوْنَ مَالِہٖ وعِرْضِہٖ فَھُوَ شَھِیْدٌ

ترجمہ: جو اپنے مال اور عزت کو بچانے میں مارا گیا وہ شہید ہے۔

دفاع کے سلسلہ میں اس طرح کی تعلیم کی وجہ سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہابیل نے کیوں کہا کہ میں تمہیں قتل کرنے کے لئے ہاتھ نہ اٹھاؤں گا۔

اس کا ایک جواب تو یہ دیا گیا ہے کہ ہابیل کی بات وعظ اور نصیحت پر محمول کی جائے کہ اس طرح کی بات سن کر قابیل کو کچھ تو احساس ہوگا کہ مجھے اپنے مخلص بھائی پر ہاتھ نہیں اٹھانا چاہئے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ بہ نیت قتل ہاتھ نہ اٹھانے کی بات ہابیل نے کہی تھی۔ مطلق دفاع نہ کرنے کی بات نہیں تھی۔ ایک تیسرا جواب حضرت مجاہدؒ نے دیا ہے کہ ممکن ہے اس وقت کی شریعت میں دفاع جائز نہ رہا ہو۔ ان حقائق کی روشنی میں ڈاکٹر صاحب کی بات کتنی غلط اور دین کی روح مسخ کرنے والی ہے۔

استعمال قوت کی حد

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں:

''تشدد کا استعمال جرائم کی سزا کے طور پر ہو یا اسلام و مسلمانوں کی بقاء وتحفظ اور انسانی حق واختیار کی بحالی کیلئے۔ قتال وتشدد اس حد تک روا ہے جتنا اس کام کیلئے ضروری ہے ورنہ وہ عدوان یا اعتداء کی تعریف میں آجائے گا جس سے سختی کے ساتھ منع کیا گیا ہے۔'' (صفحہ ۲۹)

دیکھئے ''بقاوتحفظ اور انسانی حق اختیار کی بحالی'' تک قوت استعمال کرنے اور قتال کو محدود کردیا گیا جبکہ قتال کی سب سے بڑی غرض فتنہ کو ختم کرنا اور دین اللہ کو کارفرما قوت بنانا ہے۔ یہ ایک طرح سے دیکھا جائے تو

فلسفۂ جہاد کی شہ رگ کو کاٹ دیا گیا ہے اور غلبۂ اسلام کی غرض سے جہاد و قتال کو اعتداء اور عدوان کہا گیا ہے۔ اس سے سختی کے ساتھ منع کرنے کا دعویٰ کیا گیا ہے۔ میں پورے یقین اور وثوق سے کہتا ہوں کہ بغرض ''اعلاء کلمۃ اللہ'' قتال کو نہ کہیں اِعْتِدَاء اور عُدْوَان کہا گیا ہے اور نہ اس سے منع کیا گیا ہے اس کے برخلاف اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے جہاد و قتال کا نہ صرف حکم دیا گیا ہے بلکہ اس کے لئے ترغیب اور تحریض اور تبشیر کتاب وسنت میں ایک ایسی عام بات ہے جو ناخواندہ مسلمان بھی جانتا ہے لیکن عصر حاضر کے دانشور اس کو جھٹلانے پر تلے ہوئے ہیں۔

اتنی غلط اور خلاف واقعہ بات کہنے کی وجہ سورۃ البقرہ کی آیات ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳ سے سرسری طور پر گزر جانا ہے۔ اس موقع پر تھوڑی وضاحت کردی جائے تو مناسب رہے گا۔

ایک ضروری وضاحت

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا اِنَّ اللهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ○ (البقرۃ:۱۹۰)

سرسری طور پر اس آیت کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جو مسلمانوں سے جنگ کرتے ہیں صرف ان سے جنگ کا حکم دیا گیا ہے اور جنگ نہ کرنے والوں سے جنگ کرنے کو اعتداء ''زیادتی'' کہا گیا ہے اور اس سے منع کیا گیا ہے۔

اس آیت کو بعض لوگوں نے منسوخ مانا ہے۔ اس لئے کہ متعدد آیات مثلاً سورۂ بقرہ ۱۹۳، سورۂ انفال ۳۹، سورۃ التوبہ آیت نمبر ۲۹ وغیرہ سے ثابت ہے کہ جہاد کے سلسلے میں آخری حکم جو دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ تمام مشرکین سے جہاد کرنا فرض ہے لیکن بعض دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ یہ آیت منسوخ نہیں ہے اور ''لَا تَعْتَدُوْا'' کے معنی وہ نہیں ہیں جو بادی النظر میں سمجھ میں آتے ہیں بلکہ ''لَا تَعْتَدُوْا'' کے الفاظ میں یہ کہا گیا ہے کہ حرم کے اندر جنگ کرنے میں پہل نہ کرو۔ اگر تم پہل کرو گے تو یہ اعتداء ہوگا۔ یا یہ کہا جائے کہ یہاں اہل معاہدہ سے جنگ کرنے کے ذریعے اعتداء نہ کرو، یا یہ کہ دعوت دیئے بغیر جنگ نہ کرو، یا یہ کہ عورتوں اور بچوں کو جنگ میں قتل نہ کرو۔ غرض یہ کہ اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے قتال کو کسی نے بھی اعتداء اور عدوان نہیں کہا ہے۔ اسی بناء پر ''لَا تَعْتَدُوْا'' کو یہاں منسوخ مانا گیا ہے یا اسکی ایسی شکل بتائی گئی ہے جس سے اعلاء کلمۃ اللہ کیلئے حکم قتال سے تعارض نہ ہو۔

غیر قرآنی دعوتی مصلحت

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں:

''بات صرف اتنی نہیں ہے کہ ہم پر جو تشدد ہوا اور ہو رہا ہے اس کے جواب میں تشدد کا طریقہ اختیار کرنا ہمارے لئے جائز نہ ہوگا یہ بات بھی سامنے رکھنے کی ہے کہ ایسا کرنے سے ہمارے دعوتی کام کو اور شہادت علی الناس کے مشن کو مدد ملے گی یا اسے صدمہ پہنچے گا۔''

اس میں شک نہیں کہ یہ خیال رکھنا بہت ضروری ہے کہ دعوتی مشن کو کسی طرح صدمہ نہ پہنچے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کسی مسلمان کی مدد اس خیال سے نہ کی جائے کہ ہمارے مدعوئین پر برا اثر پڑے گا یا کسی مسلم خاتون کی عصمت ریزی پر خاموشی اختیار کر لی جائے تا کہ ہمارے مدعوئین ناراض نہ ہو جائیں۔ یا شعائر اللہ کی بے حرمتی ہم اپنی آنکھوں سے دیکھیں اور چوں نہ کریں تا کہ دعوت کے مواقع باقی رہیں اس کے لئے کتاب وسنت سے دلیل لانی پڑے گی۔ ایسا تو نہیں کہ دعوتی مشن کو صدمہ سے بچانے کا نکتہ اپنے اوپر عائد ہونے والے فرائض کو ادا نہ کرنے کے لئے بہانہ ہے جو شیطان نے ہمیں سجھایا ہے اور اپنی بزدلی اور بے غیرتی پر پردہ ڈالنے کے لئے ایک شیطانی وسوسہ ہے۔ یہ وسوسہ کوئی نیا وسوسہ نہیں ہے دور اول میں بھی کچھ لوگوں کے اندر پیدا ہو رہا تھا غالباً اسی بناء پر مسلمانوں کو پوری طرح یکسو کر دیا گیا اور یہ صاف صاف بتا دیا گیا کہ اعداء دین تم سے کبھی بھی خوش اور راضی نہیں ہو سکتے اور نہ اپنی ریشہ دوانیوں سے باز آ سکتے ہیں۔

وَلَنۡ تَرۡضٰى عَنۡكَ الۡيَهُوۡدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمۡ (البقرۃ:۱۲۰)

ترجمہ: یہود اور انصاریٰ تم سے کبھی بھی خوش نہیں ہو سکتے۔ یہاں تک کہ تم ان کے طریقے کی اتباع کرو۔

لَا يَزَالُوۡنَ يُقَاتِلُوۡنَكُمۡ حَتّٰى يَرُدُّوۡكُمۡ عَنۡ دِيۡنِكُمۡ اِنِ اسۡتَطَاعُوۡا۔ (البقرہ:۲۱۷)

ترجمہ: وہ برابر تم سے جنگ کرتے رہیں گے یہاں تک کہ وہ تم کو تمہارے دین سے پھیر دیں اگر ان کا بس چلے۔

دشمنانِ اسلام کو راضی اور مطمئن رکھنے کی کوشش کرنے کی تعلیم اور ہدایت ہمیں کہیں نہیں ملتی بلکہ جو تعلیم دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ تم اپنے اوپر عائد ہونے والی ذمہ داریوں کو ادا کرو، حدود اللہ سے تجاوز نہ کرو، حالات جو کچھ بھی ہوں ہر حالت میں تقویٰ کی روش اختیار کرو اللہ کے ذکر سے غافل نہ رہو، راہ راست پر کسی کو لانا تمہاری ذمہ داری نہیں ہے تمہاری ذمہ داری بس یہ ہے کہ تم اللہ کا پیغام لوگوں تک پہنچا دو۔

نبی کریم ﷺ سے بڑھ کر حسن سلوک کرنے والا اور صبر کے ساتھ نرم رویہ اختیار کرنے والا کون ہو سکتا ہے؟ لیکن آپ ﷺ کی نرم روی اور خوش اخلاقی دعوت کے مواقع کو محفوظ نہ رکھ سکی یہاں تک کہ بالآخر آپ کو مکہ چھوڑنا پڑا۔ مدینہ تشریف لائے پھر جنگوں کا ایک لمبا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ مدعوئین کی کسی حرکت کی

اطلاع ملتے ہی کوئی نہ کوئی دستہ متحرک ہوجاتا ہے۔ یہ نہیں سوچا جاتا کہ خاموش بیٹھو ورنہ تمہارے مدعوئیں بدظن ہوجائیں گے اور دعوتی مشن کو صدمہ پہنچ جائے گا۔

دو واقعے

رجب ۲ ھ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آٹھ آدمیوں کا ایک دستہ مکہ اور طائف کے علاقے میں مدعوئین کی نقل وحرکت اور ان کے عزائم کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے روانہ فرمایا تھا۔ اس دستہ کو قریش کا ایک تجارتی قافلہ مل گیا اس کو انہوں نے پکڑ لیا ان میں سے ایک کو قتل کر دیا اور بقیہ کو گرفتار کر کے مدینہ لائے۔ یہ واقعہ رجب کے آخر میں یا شعبان کے شروع میں پیش آیا۔ مدعوئین نے پروپگنڈہ شروع کر دیا کہ مسلمان ماہ حرام کا بھی لحاظ نہیں کرتے۔ اس موقعہ پر سورۂ بقرہ کی آیت ۲۱۷ نازل ہوئی جس میں مدعوئین کے طرزِ عمل پر نکیر کی گئی کہ تم کس منہ سے مسلمانوں کے خلاف بول رہے ہو۔ ذرا اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھو اور مسلمانوں سے کہا کہ تم سادہ لوحی سے کام نہ لو اور ان کے اعتراضات سے متاثر نہ ہو یہ تو ہمیشہ اسی کوشش میں رہیں گے کہ کسی نہ کسی طریقہ سے تمہیں راہ راست سے بھٹکا دیں۔ مسلمانوں سے یہ نہیں کہا گیا کہ تم اپنے ہاتھوں دعوت کے مواقع کیوں ضائع کر رہے ہو۔

شوال ۲ ھ کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک یہودی نے ایک مسلمان انصاریہ عورت کی بے حرمتی کی تو ایک مسلمان نے اس یہودی کو مار ڈالا، یہودیوں نے اس مسلمان کو قتل کر دیا، اس معاملہ نے طول پکڑا، مسلمانوں نے یہودیوں کے قلعہ کا پندرہ دن تک محاصرہ کئے رکھا۔ پھر پورے قبیلہ کو جلاوطن کر دیا گیا۔ قرآن میں مسلمانوں کو جو ہدایات دی گئی ہیں وہ اس طرح کی ہیں۔

مسلمانو! تم دشمنانِ اسلام کے مقابلہ میں کمزور نہ پڑ جاؤ۔ وہ اپنے لئے نرمی کے بجائے تمہارے اندر سختی پائیں۔ تم ان کی طرف نہ جھکو۔ ہوشیار رہو تم سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہو جس کی وجہ سے تمہاری ہوا اکھڑ جائے۔ تم ان پر رعب ڈالنے کی کوشش میں رہو۔ الغرض مدعوئین کو مسلمانوں کے بارے میں خوش گمان رکھنے کی کوشش میں نہ تو غیرت اور ایمانی تقاضے کو پورا کرنے سے رکنے کی تعلیم دی گئی اور نہ اپنے کو سیدھا سادہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہدایت دی گئی ہے بلکہ کڑک بن کر رہنے کی بات کہی گئی تا کہ ان کی جرأتیں نہ بڑھ جائیں۔

تشدد اور دہشت گردی

اس ہیڈنگ کے تحت ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ

''جمی جمائی، مستحکم حکومتوں کے خلاف جب بھی کوئی کارروائی کی جائے گی لازماً وہ کام کرنے پڑیں گے جن

سے اسلام میں منع کیا گیا اور انہیں ان خارزاروں سے گزرنا پڑے گا جن میں قدم رکھنے سے مسلمانوں کو منع کیا گیا ہے۔ مثلاً محارب اور غیر محارب میں تمیز نہیں کی جاسکے گی، مقابل کی عورت بچے، بوڑھے اور معذور بھی مارے جائیں گے۔ مال اور املاک تلف ہوں گے، درخت وغیرہ کاٹے جائیں گے۔ آبادزمین کی ویرانی بھی ہوسکتی ہے جبکہ اسلام میں ان باتوں سے منع کیا گیا اور ان کو فساد فی الارض کہا گیا ہے۔ اسلام میں جن باتوں سے منع کیا گیا ہے ان کو لازماً اس لئے کرنا پڑے گا کہ حکومتوں کے پاس مسلح پولیس اور فوج ہوتی ہے جس کے خلاف راست کارروائی کرنا ممکن نہیں، ان کے پاس اسلحے ہوتے ہیں اور کارروائی کرنے والوں کے پاس معمولی اسلحے بھی نہیں ہوتے چہ جائے کہ حکومتوں کے برابر اسلحے ہوں۔ ان وجوہ کی بناء پر کارروائی کرنے والے مجبور ہیں کہ وہ خفیہ عمل کا طریقہ کار اختیار کریں اور جب اور جہاں موقع مل جائے اس کو دشمن کو صدمہ پہنچانے کے لئے استعمال کریں۔ اس بناء پر ان آداب کی پابندی نہیں کرسکتے جن کا اسلام پابند بناتا ہے۔

لہٰذا ریاستی تشدد اور دہشت گردی کے جواب میں جب بھی قوت استعمال کی جائے گی وہ لازماً ایسی دہشت گردی اور فساد فی الارض کی شکل اختیار کرے گی جو اسلام میں ممنوع ہے اس لئے گزشتہ بیس برسوں میں دنیا کے مختلف علاقوں میں کچھ مسلمان گروہوں کی طرف سے اپنی حکومتوں کے خلاف یا امریکہ، روس، برطانیہ، فرانس وغیرہ کے خلاف کی جانے والی کارروائیاں اسلام کی مقرر کردہ حدود سے صریح تجاوز پر مبنی تھیں۔''

سطحی استدلال

ڈاکٹر صاحب کا یہ استدلال سطحیت اور کم نظری پر مبنی ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ دعوت وتبلیغ ایک اہم فریضہ ہے مجھے اس سے انکار نہیں ہے لیکن اس زمانے میں اس فریضہ کو ادا کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ اس زمانہ میں عام طور پر لوگ صحیح باتیں سنتے نہیں اور ان کے دل کو ٹھیس لگتی ہے اور اسلام میں لوگوں کو تکلیف دینا لوگوں کے دلوں کو دکھ پہنچانا ممنوع ہے۔ لوگوں کو راحت پہنچانا، ان کے دلوں میں الفت ومحبت کا رس گھولنا، شفقت ورحمت کا باعث بننا پسندیدہ عمل ہے۔ کئی لوگ دعوت وتبلیغ کے نام سے لوگوں کے اندر بے چینی، الجھن، دکھ، نفرت اور بیزارگی پیدا کررہے ہیں جو اسلام کے مقاصد اور اسپرٹ کے خلاف ہے اور جب اور جہاں کوئی دعوت وتبلیغ کا کام کرے گا اسے خارزاروں سے گزرنا پڑے گا جن میں قدم رکھنے سے منع کیا گیا ہے۔

یہ استدلال بظاہر کتنا خوشنما ہے! لیکن درحقیقت حقیقت سے بہت دور اور واقعیت کے پرے ہے۔ کیونکہ صحیح بات یہ ہے کہ اکثر وبیشتر احکام ہدایات اور اوامر اور نواہی کی ایک حد ہوتی ہے اگر اس کو اس کی حد سے آگے پھیلا یا جائے گا تو بات غلط ہوجائے گی۔ قید وشرط اور استثناء سے خالی بہت کم احکام ہیں۔ مثلاً ماں باپ کا دل توڑنا غلط ہے، ماں باپ سے محبت کرنا بیوی کی دلجوئی کرنا۔ اپنے رشتہ داروں کا لحاظ کرنا نیکی ہے لیکن ان میں

سے کوئی چیز بھی قید وشرط اور استثنٰی سے خالی نہیں ہے۔ ان میں سے کسی چیز کو مطلق اور غیر مشروط بنا دیا جائے تو وہ نیکی نہیں بدی بن جائے گی۔ ماں باپ اگر کفر کا حکم دیں تو ظاہر ہے ان کا دل توڑنا نیکی ہوگی۔ ماں باپ اگر خدا و رسول سے دشمنی کی راہ پر چل رہے ہوں تو محبت کے بجائے ان سے دشمنی کرنا پڑے گا۔ یہی وہ چیز ہے جس کا لحاظ ڈاکٹر صاحب نہیں کر سکے جس کی وجہ سے ان کا استدلال بھی بے محل ہو گیا اور جو نتیجہ انہوں نے نکالا وہ بھی غلط ہو گیا۔ قید وشرط اور استثنٰی کی اطلاع تب ہوتی ہے جبکہ کتاب وسنت کے پورے ذخیرے پر نظر ہو۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی یہ تحریر کوتاہ نظری کا ثبوت پیش کر رہی ہے۔

مسئلہ کی نوعیت

بخاری شریف کی حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے سے منع فرمایا ہے۔

ابوداؤد کی ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ بوڑھے، بچے اور عورت کو قتل نہ کرو۔

ابوداؤد کی ایک روایت ہے کہ ایک عورت جنگ میں مقتول پائی گئی۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ما کانت هذه لتقاتل۔ یہ جنگ کرنے کے لئے تو نہیں تھی۔

اس سے فقہاء نے مسئلہ نکالا ہے کہ جو بھی جنگ کرے وہ قتل کیا جائے گا خواہ عورت ہو یا بوڑھا۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے ایک عورت کو قتل کیا جس نے خلاد بن سوید پر چکی پھینک کر قتل کر دیا تھا۔ یوم خندق کے موقع پر بھی ایک عورت قتل کی گئی تھی۔

حدیث کی کتابوں میں حُرْمَةُ قَتْلِ النِّسَاءِ وَالصِّبْيَانْ کا عنوان جہاں ملتا ہے وہیں جَوَازُ قَتْلِ النِّسَاء والصِّبْيَانْ کی ہیڈنگ بھی ملتی ہے۔ یعنی عورتوں اور بچوں کے قتل کی حرمت اور جواز دونوں حالات کے اعتبار سے ثابت ہیں۔ بوڑھے کو قتل کرنا ممنوع ہے لیکن جنگ حنین میں درید بن صمہ بوڑھے کو قتل کیا گیا کیونکہ وہ جنگی معاملات میں رائے دیتا تھا۔

> مسألة ... يجوز تبييتهم وهو كبسهم ليلاوان كان فيهم نساء واطفال ومسلمون وبهذا قال احمد بن جنبل وقال لا نعلم احدا كره بيات العدو وهل تغزو الروم الا البيات۔ (كشاف القناع)
>
> ويجوز نصب المنجنيق عليهم ورميهم بالنار و ارسال الماء عليهم وان كان فيهم نساء و صبيان منهم فان كان فيهم مسلم اسير او تاجر او مستامن كره ان لم تكن ضرورة والا لم يكره على المذهب۔ (مغني المحتاج)

الزرع والشجر فی دار الحرب ینقسم ثلاثۃ اقسام
احدھا ماتدعوالحاجۃ الی اتلافہ کالذی بقرب حصونھم ویمنع من قتالھم
اویحتاج الی قطعہ لتوسعۃ طریق او تمکن من قتال او ستارۃ منجنیق اوغیرہ۔
اویکونون یفعلون ذالک بنافنقتلہ بھم لینتھوا ھذا جائز بغیر خلاف۔
(مشارق الاشواق)

ہم نے حدیث اور فقہ سے جو یہ چند باتیں پیش کی ہیں ان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو مارنے سے منع کیا گیا ہے۔ اسی طرح مال و اسباب، کھیتی اور باغ کو تلف کرنے سے روکا گیا ہے لیکن یہ حکم ممانعت اسی وقت تک کے لئے ہے جبکہ اس کی جنگی ضرورت متقاضی نہ ہو، عورت، بچہ، بوڑھا، کھیت اور باغ وغیرہ دشمن پر قابو پانے اور دشمن کی قوت توڑنے میں حائل اور مانع ہوں تو ان کی کوئی پرواہ نہیں کی جائے گی چنانچہ کفار اگر مسلمانوں کو ڈھال کے طور پر اپنی فوج کے آگے رکھیں تو ان کی وجہ سے حملہ روکا نہیں جائے گا۔ حملہ کیا جائے گا لیکن نیت ان کے مارنے کی نہ رکھی جائے اصل نیت کفار کو مارنے کی کی جائے۔

ان معلومات کو سامنے لانے سے ہمارا مقصد یہ بتانا ہے کہ امریکہ وغیرہ کے خلاف کئے جانے والے اقدامات کو جس بنیاد پر غلط اور غیر شرعی عمل بتایا جارہا ہے وہ دراصل کوئی بنیاد ہی نہیں ہے۔ ظلم وجور اور انسانیت سوز حرکتوں کے خلاف کی جانے والی کارروائیوں کی مذمت کرنا، تغلیط کرنا اور اسلامی حمیت اور ایمانی غیرت کے تحت زبان اور ہاتھ سے کام کرنے والوں کو ملامت کرنا دینی اور ملی جرم ہے جس کو تاریخ کبھی معاف نہیں کرے گی۔ بالخصوص جبکہ اس ملامت کی بنیاد ناقص معلومات پر رکھی گئی ہے۔ اس تناظر میں ہم ڈاکٹر صاحب سے خواہش کریں گے کہ اپنے موقف پر نظر ثانی فرمائیں اور قوم وملت کی صحیح رہنمائی فرمائیں اور اپنے مقام کو پہچانیں۔

آخری بات

تین سوال

مسلمان اس زمانہ میں اپنے اوپر ہونے والے ظلم و زیادتی کے مقابلہ میں شرعی لحاظ سے کیا کر سکتے ہیں اور کیا نہیں کر سکتے ہیں؟ اس سوال کا جواب تلاش کرتے ہوئے خصوصی طور پر مندرجہ ذیل تین سوالوں کا جواب بھی تلاش کیجئے۔

پہلا سوال: حضرت ابوالبصیرؓ اور ان کے ساتھیوں کی پالیسی صحیح تھی یا غلط؟

ایک صحابی رسول حضرت ابوالبصیرؓ مکہ میں مسلمان ہو گئے تھے۔ صلح حدیبیہ کے بعد مدینہ آئے۔ ان کے پیچھے ہی مکہ سے از ہر بن عبد عوف اور اخنس بن شرفی کا ایک مکتوب رسول اللہ ﷺ کے نام مدینہ دو آدمی لائے کہ حدیبیہ کے معاہدہ کی رو سے ابوالبصیرؓ کو واپس کر دیا جائے۔ حضور ﷺ نے ابوالبصیرؓ کو بلایا اور فرمایا ''ابو البصیر! ہم نے اس قوم سے جو عہد کیا ہے وہ تمہیں معلوم ہے۔ ہمارے دین میں عہد شکنی نہیں ہے۔ تم مکہ چلے جاؤ۔ اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اور دوسرے کمزور مسلمانوں کے لئے کوئی راہ پیدا کرے گا۔

ابوالبصیرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! کیا آپؐ مجھے مشرکوں کی طرف واپس کر رہے ہیں؟ جو میرا دین برباد کر دیں گے۔ حضور ﷺ نے پھر فرمایا ''مکہ چلے جاؤ اللہ کوئی راہ نکالے گا'' حضرت ابوالبصیرؓ مکہ کے لئے روانہ ہو گئے۔ لیکن راستہ میں انہوں نے مقام ذوالحلیفہ میں اپنے دونوں پہرہ داروں میں سے ایک کو دھوکہ دے کر قتل کر دیا، دوسرا پہرہ دار ڈر کر مدینہ چلا گیا اور وہاں حضور ﷺ سے ابوالبصیرؓ کی شکایت کی۔ اس کے بعد ساتھ ہی ابوالبصیرؓ بھی مدینہ پہنچ گئے اور حضور ﷺ سے عرض کیا یا رسولؐ اللہ! آپ کی ذمہ داری پوری ہو گئی۔ اس کے بعد ابوالبصیرؓ مدینہ سے مقام عیص چلے گئے۔ عیص اس راستہ پر ہے جس سے ہو کر وہ شام جاتے تھے جو سمندر کے ساحل پر ذوالمرہ کے کنارے واقع ہے۔ مکہ میں جو مسلمان روک لئے گئے تھے وہ اس واقعہ سے واقف ہو چکے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کہا تھا اس کو جان چکے تھے اس لئے وہ عیص میں ابوالبصیرؓ سے آ کر مل گئے۔ اس طرح تقریباً ستر آدمی جمع ہو گئے اور انہوں نے قریشیوں کا قافیہ تنگ کر دیا وہ جس قریشی کو پاتے اسے قتل کئے بغیر نہ چھوڑتے اور جو قافلہ ان کے پاس سے گزرتا اس پر چھاپہ مارتے۔

جس وقت حضرت ابوالبصیرؓ اپنی کارروائی کر رہے تھے، اس وقت مدینۃ الرسول دارالاسلام کا صدر مقام تھا جس کے سربراہ بذات خود رسول خدا ﷺ کی ذات تھی۔ ابوالبصیرؓ اپنے ساتھیوں کو لے کر جو کچھ کر رہے تھے حضور ﷺ کی اجازت اور حکم سے نہیں کر رہے تھے بلکہ اپنے طور پر کر رہے تھے ورنہ مشرکین ضرور اعتراض کرتے کہ حدیبیہ میں طے شدہ معاہدہ کی یہ خلاف ورزی ہے۔ پھر بھی آپؐ کو سب کچھ معلوم تھا جس پر آپؐ نے کوئی نکیر نہیں فرمائی جب کہ یہ ناممکن ہے کہ خلاف شرع کوئی کام ہو رہا ہو اور آپ ﷺ خاموش رہیں۔ اسی لئے آپ ﷺ کی خاموشی یعنی اقرار کو شریعت میں ایک مضبوط دلیل تسلیم کیا جاتا ہے، پس حضور ﷺ کی خاموشی حضرت ابوالبصیرؓ کی ساری کارروائیوں کے صحیح ہونے کی دلیل ہے جو بہت ساری قیل وقال کا دروازہ بند کر دیتی ہے۔ کسی ملک میں مسلمانوں کیلئے کوئی حکمت عملی متعین کرنے کیلئے یہ ایک واقعہ کافی ہو سکتا ہے۔

موجودہ زمانے میں ابوالبصیرؓ کا نمونہ

آج ابوالبصیرؓ کے اس واقعہ کو دلیل بنا کر کوئی جتھا کسی جنگل، پہاڑ یا کسی مقام کو اپنا اڈہ بنا کر دشمنان دین و ملت کو نشانہ بنائے تو کیونکر غلط ہوسکتا ہے؟ اور اگر کہا جائے کہ حضور ﷺ کی خاموشی کی وجہ یہ تھی کہ یہ واقعہ دارالاسلام مدینہ کے باہر ہو رہا تھا۔ اس لئے آپ ﷺ نے اس سے تعرض نہیں فرمایا تو یہ توجیہ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ آپ ﷺ کی رسالت اور نبوت ساری دنیا کے لئے تھی۔ دنیا میں جہاں کوئی مسلمان ہوگا آپ کے حکم کے تابع ہوگا۔ حضرت ابوالبصیرؓ آپ کے حدود رسالت و اطاعت کے باہر نہ تھے اور اگر اس توجیہ کو صحیح مان لیا جائے تو ہمارے مدعا کو مزید ثبوت اور قوت حاصل ہوگی اور یہ ثابت ہوگا کہ کہیں بھی چند مسلمان اکٹھا ہو کر دین و ملت کے دشمنوں کے خلاف محاذ آرائی کر سکتے ہیں اور اس کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ مسلمانوں کی وسیع پیمانہ پر شرعی حکومت قائم ہو اور وسیع علاقہ پر امیر المؤمنین یا خلیفۃ المسلمین کا سکہ جاری ہو۔

دوسرا سوال: قبیلہ بنی عقیل کے آدمی کو صحابہ کا پکڑنا صحیح تھا یا غلط؟

عن عمران بن حصین قال کان ثقیف حلیفا لبنی عقیل فاسرت ثقیف رجلین من اصحاب رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم واسر اصحاب رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم رجلا من بنی عقیل فاوثقوہ فطرحوہ فی الحرۃ فمر بہ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فناداہ یا محمد یا محمد فیما اخذت قال بجریرۃ حلفاء کم ثقیف فترکہ و مضی فناداہ یا محمد یا محمد فرحمہ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فرجع قال ماشانک قال انی مسلم فقال لوقلتھا وانت تملک امرک افلحت کل الفلاح قال ففداہ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم بالرجلین الذین اسرھما ثقیف۔ (رواہ مسلم)

ترجمہ: عمران بن حصین سے روایت ہے کہ قبیلہ ثقیف حلیف تھا قبیلہ بنو عقیل کا۔ ثقیف کے لوگوں نے دو مسلمانوں کو قید کر لیا تھا۔ صحابہ کرامؓ نے انتقام میں قبیلہ بنی عقیل کے ایک آدمی کو پکڑ لیا اور اس کو باندھ کر گرم پتھر پر ڈال دیا۔ اللہ کے رسول ﷺ کا اس کے پاس سے گزر ہوا۔ وہ آدمی چلایا۔ یا محمد یا محمد، مجھے کس جرم میں پکڑا گیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تمہارے حلیف ثقیف کے جرم میں۔ اتنا کہہ کر آپ آگے بڑھ گئے۔ اس نے پھر آواز دی۔ یا محمد یا محمد۔ اس پر آپ ﷺ کو ترس آ گیا اور آپ لوٹ پڑے اور پوچھا تمہارا کیا حال ہے اس نے کہا میں مسلمان ہو گیا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: جس وقت تم آزاد تھے اس وقت اگر تم نے یہ بات کہی ہوتی تو تم پوری طرح کامیاب ہو گئے ہوتے۔ اس کے بعد آپ نے

اس آدمی کو دونوں مسلمانوں کی رہائی کی شرط پر چھوڑا۔

تیسرا سوال: کیا امت کو پہاڑوں، دریاؤں اور مصنوعی سرحدوں کی بنیاد پر تقسیم کیا جا سکتا ہے؟

کیا مسلمانوں کے باہمی تعاون کو مصنوعی سرحدوں میں محدود کیا جا سکتا ہے؟ حدیث رسول ﷺ کے بموجب مسلمان جسد واحد کے مانند ہیں کہ جسم کے ایک عضو کو تکلیف ہوتی ہے تو پورا جسم تکلیف میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ کیا یہ اخوت کا نظریہ انسانوں کی بنائی ہوئی حد بندیوں کا پابند ہے۔ اس سوال کا جواب ہمارے فقہاء نے نفی میں دیا ہے اور کہا ہے کہ جب مسلمانوں کی زمین کے کسی حصہ پر غیر قابض ہو جائیں تو سب مسلمانوں پر درجہ بدرجہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ غیر کے قبضہ اور تسلط کو ختم کریں۔ لیکن ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی صاحب نے اس سوال کا جواب اثبات میں دیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں:

> ''ہمارا موقف یہ ہے کہ موجودہ حالات میں امریکہ کے خلاف تشدد کا عمومی استعمال مسلمانوں کے لئے نہ تو جائز ہے اور نہ مفید۔ بلکہ اس کے برعکس اس سے خود اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ البتہ جب امریکہ کسی مسلمان ملک پر ناحق حملہ کرے جیسا کہ اس نے عراق پر کیا ہے تو بے شک مسلمانوں کو اپنے ملک کے دفاع میں لڑنے کا اختیار ہے مگر یہ طریقہ متعلقہ لوگ ہی اختیار کر سکتے ہیں۔''

سوال یہ ہے کہ فلسطینی اور عراقی مسلمانوں کی مصیبت کو اگر ساری دنیا کے مسلمان اپنی مصیبت سمجھیں اور ان کے دشمن کو اپنا دشمن سمجھیں اور اپنی استطاعت کے مطابق دفاع میں شریک ہوں تو کیوں جائز نہیں ہوگا؟! بالخصوص جبکہ جن مسلمانوں پر ظلم ڈھایا جا رہا ہے وہ اپنا دفاع کرنے سے عاجز ہو رہے ہیں۔ جو کچھ کریں متعلقہ لوگ ہی کریں۔ اس ذہن نے ایک مسلم ملک کو دوسرے ملک سے بے تعلق کر رکھا ہے۔ ایک ملک میں ایک شہر کے لوگوں کو دوسرے شہر کے لوگوں سے کاٹ دیا ہے اور اسی ذہنیت کے تحت ایک شہر میں بھی مشرق و مغرب اور محلہ اور غیر محلہ کا فرق کیا جاتا ہے۔ مزید براں گروپ، جماعت اور پارٹی کی بنیاد پر بھی برتاؤ میں فرق کیا جاتا ہے اور اخوت اسلامی، تعاون علی البر اور کلمہ کی بنیاد پر اتفاق و اتحاد کی ذہنیت مضمحل ہوتی جا رہی ہے۔

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضاء میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور



ڈاکٹر فضل الرحمٰن فریدی صاحب کا مضمون



''زندگیِ نو'' اگست ۹۷ء کے اشارات میں مدیر زندگی ڈاکٹر فضل الرحمن فریدی صاحب نے نو جوانوں کے ایک گروپ کو مخاطب کر کے چند نہایت غلط باتیں لکھی ہیں۔ اتنی کم ظرفی، گراوٹ اور نادانی کی امید کسی عام مسلمان سے نہیں کی جاسکتی چہ جائے کہ جماعت اسلامی کی مرکزی مجلس شوریٰ کا کوئی معزز رکن ہو۔

☆ جماعت کا یہ کردار رہا ہے کہ کسی تعصب کی بناء پر کوئی غلط بات نہ کہی جائے لیکن فریدی صاحب نے کئی دینی اور ملی اقدار کو پامال کیا ہے۔

- جماعت کے بزرگوں کی یہ حکمت عملی رہی ہے کہ کسی بھی گروپ کو اپنے خلاف منہ کھولنے کا موقع نہ دیا جائے۔ لیکن فریدی صاحب نے اس کے خلاف مظاہرہ کیا ہے۔
- اُمّتِ مسلمہ کے سوادِ اعظم کے خیر امت میں شمولیت کا انکار کیا ہے اور اپنے کو اُمّتِ مسلمہ سے علیحدہ کوئی چیز ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جو جماعت کے اصل موقف کے خلاف ہے۔
- جماعت اسلامی ہند اُمّتِ مسلمہ کا ایک عظیم سرمایہ ہے مگر اس عظیم سرمایہ کو کچھ لوگ ملیامیٹ کرنے پر جیسے تلے ہوئے ہیں اور خیر خواہوں کی باتوں کو سُنی ان سُنی کر رہے ہیں اور بقول مولانا صدر الدین اصلاحیؒ کے ناشدنی کا برابر ارتکاب کیا جا رہا ہے۔ اس روکو روکنے کے لئے فریدی صاحب کے خیالات پر ایک نظر ڈالی جارہی ہے۔ غور فرمایئے:

فریدی صاحب فرماتے ہیں:

> ''بعض نوجوان کہتے ہیں کہ جذبۂ سرفروشی دین کی اصل ہے یہ اس کی ابتداء بھی ہے اور انتہاء بھی اور جس کا دل سرفروشی کی تمنا سے خالی ہو وہ منافق ہے بزدل ہے اور مصلحت کوش ہے''

مدیر ''زندگیِ نو''! افسوس کی بات ہے کہ آپ کے نزدیک سرفروشی کی تمنا اور جذبہ سرفروشگی رکھنے والے

نوجوان قابل نفرت اور لائق ملامت ہیں حالانکہ ''زندگی نو'' کے اسی شمارے میں ایک نوجوان نہیں بلکہ سفید ریش بزرگ نے لکھا ہے (''ایمان باللہ کی حقیقی کسوٹی جہاد فی سبیل اللہ ہے اور یہی وہ کسوٹی ہے جس پر کھرے اور کھوٹے کو آسانی کے ساتھ پرکھا جاسکتا ہے۔ ہمیں اپنے ایمان کا اندازہ کرنا ہو تو اپنی زندگی کا جائزہ لے کر دیکھنا چاہئے کہ راہ حق میں مصائب ومشکلات کو برداشت کرنے کی کس قدر خواہش اور آرزو موجود ہے اللہ کے راستے میں جدوجہد اور سرفروشی کی خواہش تو اسی صورت میں پیدا ہوسکتی ہے جبکہ ہم نظام باطل اور کافرانہ ماحول سے غیر مطمئن ہوں اور اسے بدلنے کی تڑپ اپنے دلوں میں رکھتے ہوں'') غالباً آپ کے نزدیک جذبۂ سرفروشی قابل نقد وملامت اس لئے ٹھہرا ہے کہ آپ حضرات فی الحال نظام باطل کو نعمت غیر مترقبہ سمجھ رہے ہیں لیکن آپ ان آیات اور احادیث کے متعلق کیا کہیں گے جن میں جذبۂ سرفروشی پیدا کرنے کے لئے ابھارا گیا ہے، مثلاً:

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَشْرِى نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ رَءُوفٌ بِالْعِبَادِ

(البقرۃ:۱۹۴)

ترجمہ: اور لوگوں میں سے کوئی وہ ہے جو اس کی رضا تلاش کرنے کے لیے اپنی جان بیچ دیتا ہے اور اللہ بندوں پر بڑا مہربان ہے۔

مزید شرح صدر کے لئے سورۂ بقرہ ۲۱۸، سورۂ آل عمران ۱۷۰، سورۂ توبہ ۱۹، ۲۰، ۸۸، ۸۹ کا صرف ترجمہ ملاحظہ فرمالیں، اسی طرح دو حدیثیں بھی اپنے سامنے رکھیں اور پھر غور فرمائیں کہ آپ کس چیز کو قابل نفرت قرار دے رہے ہیں؟

من لم یغز ولم یجھز غازیا او یخلف غازیاً فی اھلہ بخیر اصابہ اللّٰہ بقارعۃ قبل یوم القیامۃ (ابوداؤد)

ترجمہ: جس نے جنگ نہیں کی اور نہ کسی غازی کو تیار کیا اور نہ کسی غازی کی عدم موجودگی میں اس کے اہل وعیال کی دیکھ بھال کی تو اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو قیامت سے پہلے ایک سخت مصیبت سے دوچار کردے گا۔

دوسری حدیث ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: مَنْ مَاتَ وَلَمْ يَغْزُ وَلَمْ يُحَدِّثْ نَفْسَهُ بِهِ، مَاتَ عَلَى شُعْبَةٍ مِنْ نِفَاقٍ. (رواہ مسلم وابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جس کو موت آئی اس حال میں کہ اس نے نہ کبھی جہاد کیا اور نہ اس کے اندر کبھی اس کی اُمنگ ہوئی تو وہ کسی قدر نفاق کی حالت میں مرا۔

اس طرح کی صریح آیات اور احادیث کے ہوتے ہوئے نہیں معلوم آپ حضرات کس طرح اور

کس بنیاد پر جذبۂ سرفروشی کے اظہار کو گوارا کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اسی صورت حال کو دیکھتے ہوئے مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی سے شائع ہونے والی ایک کتاب میں لکھنے والے نے لکھا ہے کہ

''بات نا تمام رہے گی اگر میں یہ وضاحت نہ کروں کہ یہی وہ تاریک دور ہے جس میں اسلامی غیرت وحمیت کی بھٹیاں سرد ہیں ورنہ اس سے پہلے مسلمانوں پر کوئی ایسا دور نہیں گزرا کسی بھی دور میں مسلمانوں نے جہاد کو نہ ترک کیا اور نہ اس کے سلسلے میں کوتاہی کی یہاں تک کہ علماء وصوفیاء اور اہل صنعت وحرفت بھی ہمیشہ ذوق جہاد سے سرشار رہتے۔

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ جو زبردست فقیہ وزاہد تھے بیشتر وقت جہاد میں گزارتے۔ حضرت عبدالواحد بن زیدؒ جو پایہ کے صوفی اور زاہد تھے ان کا بھی یہی حال تھا حضرت شفیق بلخیؒ جو وقت کے امام تصوف تھے خود بھی جہاد میں پیش پیش رہتے۔ تلامذہ کے اندر بھی روح جہاد پھونکتے، بدر عینیؒ شارح بخاری جو زبردست فقیہ و محدث تھے ایک سال جہاد کرتے ایک سال درس دیتے اور ایک سال حج کرتے، قاضی اسد بن فرات مالکیؒ وقت کے امیر البحر تھے، امام شافعیؒ دس؍ تیر چلاتے اور کوئی تیر خطا نہ کرتا، ہمارے بزرگ اسلاف ایسے تھے تو پھر ہمیں بھی کیا ان کے ساتھ کوئی نسبت ہے!''

فریدی صاحب فرماتے ہیں:

''ان کے نزدیک سرفروشی کے معنی تصادم اور سردھڑ کی بازی لگانے کے ہیں اور اس کی ابتداء دعوت کے آغاز سے ہو جاتی ہے۔ ادھر زبان سے کلمۂ ایمان کا اعلان ہوا اُدھر تصادم کی ابتداء ہوئی پھر نہ صلح جوئی کی گنجائش ہے اور نہ نرمی اور مدارات کی۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ طاغوت اور باطل قوتوں کا ازالہ صرف تصادم کے ذریعہ ممکن ہے موعظِ حسنہ کی گنجائش ہے نہ جدال احسن کام آتا ہے اور نہ ترغیب وتفہیم کا عمل کارگر ہوتا ہے بس ان قوتوں کا ہاتھ توڑنا چاہئے اور ان کی زبان بند کر دینی چاہئے اور اگر ابتداء ہی سے اس کی تیاری نہ کی گئی تو دین کی تعلیمات کی خلاف ورزی اور جذبۂ سرفروشی کی نفی ہوگی۔''

سرفروشی کے معنی اس کے علاوہ کچھ اور ہوں تو بتایئے۔ تاریخ اسلامی سے کوئی مثال پیش کیجئے جس میں دعوت کے آغاز ہی سے تصادم کی ابتداء نہ ہوئی ہو اور داعی کو پھولوں کا ہار پہنایا گیا ہو۔

جب حضرت نوح علیہ السلام نے کہا:

اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ (الشعراء:۱۱۵)

ترجمہ: میں صرف کھلا ڈرانے والا ہوں۔

تو قوم نے جواب دیا: قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ (الشعراء:۱۱۶)

ترجمہ: انھوں نے کہا اے نوح! اگر آپ باز نہ آئے تو آپ ضرور ان لوگوں میں سے ہو جائیں گے جن کو سنگسار کر دیا گیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اُن کے باپ نے کہا:

لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا (مریم:۴۶)

ترجمہ: اگر تم باز نہ آئے تو میں تمہیں ضرور سنگسار کر دوں گا اور تم مجھ سے ایک طویل مدت کے لیے دور ہو جاؤ۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرعون نے کہا:

ذَرُوْنِيْٓ أَقْتُلْ مُوْسٰى إِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ (الغافر:۲۶)

ترجمہ: چھوڑ دو مجھے میں موسیٰ کو قتل کر دوں، مجھے اندیشہ ہے کہ وہ تمہارے دین کو بدل دے گا۔

حضرت شعیب علیہ السلام سے ان کی قوم نے کہا:

وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنَاكَ (ھود:۹۱)

ترجمہ: اگر تمہاری قوم نہ ہوتی تو ہم تم کو پتھروں سے مار کر ہلاک کر دیتے۔

کئی رسولوں سے ان کی قوموں نے کہا کہ:

لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهُوْا لَنَرْجُمَنَّكُمْ وَلَيَمَسَّنَّكُمْ مِّنَّا عَذَابٌ أَلِيمٌ (یٰسین:۱۸)

ترجمہ: اگر تم باز نہ آؤ گے تو ہم تم کو پتھروں سے مار کر ہلاک کر دیں گے اور ہماری طرف سے تم عذاب سے دوچار ہو گے۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور خود نبی آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ان کی قوم نے کیا کیا، پہلی بار کوہ صفا سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کو پکارا تو ابولہب نے کس ردِ عمل کا اظہار کیا، پھر اس کے بعد ایذا رسانیوں اور معرکہ آرائیوں کا ایک لمبا سلسلہ ہے جس کو یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔ آپ بتائیے کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ......

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

نرمی مدارات کی کوئی گنجائش نہیں اس کی دلیل میں متعدد آیات قرآنی پیش کی جا سکتی ہیں۔

وَلَا تَرْكَنُوْٓا إِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ (ھود:۱۱۳)

ترجمہ: ظالموں کی طرف ذرا نہ جھکو ورنہ تم آگ کی لپیٹ میں آجاؤ گے۔

وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ (المائدۃ:۴۹)

ترجمہ: اور ان سے ہوشیار رہو کہ وہ تمہیں اللہ کی وحی کردہ بعض باتوں سے بھٹکا دیں۔

اسی کے ساتھ سیرت نبوی ﷺ کا وہ واقعہ بھی یاد کیجئے جب آپ ﷺ نے فرمایا تھا خدا کی قسم اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ میں سورج اور دوسرے ہاتھ میں چاند بھی لاکر رکھ دیں تو بھی میں اپنی دعوت کو نہیں چھوڑ سکتا یا تو اللہ اسے غالب کردے یا میں اسی راہ میں فنا ہو جاؤں۔

اب بتائیے نرمی اور مدارات کے لئے آپ کے پاس کیا دلیل ہے؟

★ طاغوت اور باطل قوتوں کا ازالہ کہیں ہنسی خوشی ہو گیا تو اس کی کوئی مثال پیش کر دیجئے۔

★ یہ بات نہیں ہے تو قرآن میں تیاری کرنے کی کیوں تاکید کی گئی؟

وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ ...الخ (الانفال:٦٠)

ترجمہ: اور جس قدر تم سے ہو سکے کافروں کے لئے ہتھیار اور پلے ہوئے گھوڑے تیار رکھو۔ اس کے ذریعہ اللہ کے دشمن اور اپنے دشمن ڈراؤ۔

مسلمانوں کو خیر امت کہنا

فریدی صاحب فرماتے ہیں:

''یہ عزیز نوجوان یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ یہ ضروری نہیں کہ موجودہ مسلم قوم اور دعوت اسلامی کے مفادات ہمیشہ ہم آہنگ ہوں اور مسلم قوم کے مفادات اور دین حق کے مفادات کو گڈ مڈ کرتے ہیں اقدام امت اور احیاء امت جیسی اصطلاحات کا اعلان کرتے وقت مسلمان کے نام سے پہچانے جانے والے گروہ کو خیر امت قرار دیتے ہیں۔''

اگر یہ بات صحیح نہیں ہے تو آپ نے اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کے نام پر وہ کام کیسے حلال کر دیا جس کو بانی تحریک نے شرعی دلائل کی روشنی میں حرام قرار دیا تھا اور کہا تھا کہ ''ان کیلئے ووٹ دینا بھی حرام ہے کیونکہ ووٹ دینے کے معنی یہی ہیں کہ ہم اپنی رائے سے کسی ایسے شخص کو منتخب کرتے ہیں کہ جس کا کام موجودہ دستور کے تحت وہ قانون سازی کرنا ہے جو عقیدۂ توحید کے منافی ہے۔''

اقدام امت اور احیاء امت کے الفاظ بھی آپ کے لئے بارگراں ہیں تو بتائیے کیا آپ امت کو بے حوصلہ بنانے اور امت کو مردہ کرنے کے لئے کوشاں ہیں یا پھر بتائیے کہ آپ کا ہر مقرر ''كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ'' والی آیت پڑھ کر کیوں بات شروع کرتا ہے؟ کیا یہ آیت آپ لوگوں کی جاگیر ہے کہ آپ پڑھیں تو ٹھیک اور دوسرا پڑھے تو غلط۔

فریدی صاحب فرماتے ہیں:

''ان کی سب سے مہلک غلطی یہ ہے کہ وہ انسانیتِ عامہ کے قبول حق کی استعداد کو نہایت محدود اور ناقص سمجھتے ہیں۔''

قبول حق کی استعداد محدود ہے یا غیر محدود یہ بحث آپ کے ذہن کی اختراع ہے مانا کہ غیر محدود ہے لیکن سوال یہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کو ہجرت اور قتال کرنے کی ضرورت کیوں پیش آتی رہی؟ آپ جس معنی میں غیر محدود لے رہے ہیں، اس کے اعتبار سے ہر دور میں غیر محدود لوگ مشرف بااسلام ہوئے مگر تاریخ اس کے خلاف گواہی دے رہی ہے اَكْثَرُهُمْ كَافِرُوْنَ، اَكْثَرُهُمْ كَاذِبُوْنَ، اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ، اَكْثَرُهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ کے الفاظ قرآن میں بکثرت آئے ہیں اس کے علاوہ مَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُؤْمِنِيْنَ کا جملہ ۸؍ بار آیا ہے، آخر یہ کیا ہے، اس سے قبول حق کی استعداد محدود ثابت ہوتی ہے یا غیر محدود۔ غور فرمائیے:

فریدی صاحب فرماتے ہیں:

''اگر انہیں عصری تاریخ سے واقفیت ہوتی تو وہ اس نتیجہ پر پہنچ سکتے کہ ''سوویت یونین کا حالیہ انقلاب صرف سیاسی اور نفسیاتی پروپگنڈے کے ذریعہ وقوع پذیر ہوا اور عوام کی استعداد قبولیت کا براہ راست نتیجہ تھا ایرانی انقلاب تو عوام کی غیر معمولی قبولیت حق کا مظہر ہے یہ انقلاب ظاہری تبدیلی نہیں بلکہ بنیادی اور حقیقی تبدیلی کا مظہر ہے جس میں ترغیب، تفہیم، تعلیم اور دعوت حق کو نہایت موثر انداز سے استعمال کیا گیا تھا، اس انقلاب نے ایک بار پھر ثابت کر دیا ہے کہ مظلوم اور مقہور عوام اگر چاہیں تو جبر اور قہر کے باوجود حق کو قبول اور باطل کو رد کر سکتے ہیں۔''

سوویت یونین کے حالیہ انقلاب سے کونسا انقلاب مراد ہے؟ اگر حالیہ زمانہ میں روس کے ٹوٹنے کی طرف اشارہ ہے تو یہ ایک کھلی حقیقت کو جھٹلانے کی جسارت ہے اس لئے کہ روس کی پسپائی کا سب سے بڑا اور نمایاں سبب افغان مجاہدین کا جذبۂ سرفروشی ہے اور میدان میں شکست کے بعد بالآخر اسے بکھر جانا پڑا۔ تاریخ میں ہمیشہ ایسا ہی ہوا ہے جو گروہ میدان میں ہار جاتا ہے اسے ہر شعبۂ زندگی میں ہارنا پڑتا ہے اور اگر حالیہ انقلاب سے کمیونسٹ انقلاب مراد ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ زار روس کس کے وعظ اور تفہیم سے تخت شاہی سے اتر گیا اور ملک روس کو کمیونسٹوں کے حوالہ کر دیا۔ مظلوم اور مقہور کے حق کو قبول اور باطل کو رد کرنے کا سوال نہیں ہے سوال یہاں یہ ہے کہ شاہ ایران ترغیب و تعلیم سے ایران کو چھوڑ کر بھاگا یا عوام کے تصادم کی تاب نہ لا سکا؟

فریدی صاحب فرماتے ہیں:

''ان کی دوسری غلطی یہ ہے کہ انہوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ کو غیر شعوری طور پر آئیڈیل مان کر اور ان کی موجودہ معاشرتی اور اخلاقی زندگی کو نظر انداز کر کے ایک خیالی دنیا بنا رکھی ہے۔''

اس کا کوئی حوالہ ہو تو پیش فرمائیے۔لیکن اس سے آپ کے ذہنی مرض کا پتہ چلتا ہے کہ اب آپ حقیقت میں قیام حکومت الٰہیہ، قیام نظام اسلامی اور اقامت دین کی خیالی دنیا سے نکل کر سیکولر جمہوریت کی حقیقی دنیا بسانے کی فکر میں لگ جائیں، مگر آپ کو یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ آپ کی حقیقی دنیا اس وقت تک نہیں بس سکتی جب تک کہ مولانا مودودیؒ کا لٹریچر لوگوں کو آپ پڑھاتے رہیں گے آپ کی راہ میں نوجوانوں کا کوئی گروہ رکاوٹ نہیں ہے بلکہ اصل رکاوٹ تفہیم القرآن اور مولانا کی دیگر تحریریں ہیں۔

فریدی صاحب فرماتے ہیں:

''علم سے محروم، پیغام حق سے تہی داماں اس عظیم گروہ کے بارے میں یہ موقف رکھنا کہ اس نے اتمام حجت کے بعد محض سرکشی کی وجہ سے اسلام کو رد کر دیا ہے محض جہالت ہے۔اور ہٹ دھرمی ہے۔''

آپ کے نزدیک نوجوان جہالت اور ہٹ دھرمی میں مبتلا ہیں یا آپ جہالت اور ہٹ دھرمی کا شکار ہو گئے۔ واقعہ جو بھی ہو ہم اس سے تعرض کرتے ہیں البتہ ہم دریافت کرتے ہیں کہ کیا آپ کے نزدیک اس عظیم گروہ کو مکمل آزادی دے دینی چاہئے کہ ہاشم پورہ میں نوجوانوں کا قتل عام کرے، عیدگاہ مراد آباد میں نمازیوں کو گولیوں سے بھون ڈالے، سورت میں مسلم خواتین کو ننگی کر کے نچائے اور دن کی روشنی میں بابری مسجد کو منہدم کر دے؟

جس گروہ میں گاندھی اور نہرو جیسے سیاست داں، راجندر پرشاد اور رادھا کرشنن جیسے فلسفی پیدا ہوئے ہیں اس گروہ کو آپ علم سے محروم کہتے ہیں۔ یہ آپ کی سادہ لوحی ہے جو لوگ ساری دنیا کے علوم وفنون کو کھنگال ڈالتے ہیں اور جن میں آج بھی ہر فن کے ماہرین موجود ہیں وہ قرآن اور اسلام ہی سے کیوں ناواقف ہیں؟!

فریدی صاحب فرماتے ہیں:

''ان کی تیسری غلطی یہ ہے کہ باطل افکار اور طاغوتی نظریات اور ان کے علمبرداروں کے درمیان فرق نہیں کرتے۔''

واقعہ ہے کہ نوجوانوں سے یہ غلطی ہو رہی ہے کہ باطل افکار اور طاغوتی نظریات اور ان کے علمبرداران دونوں سے دوری اور اجتناب کا رویہ اختیار کئے ہوئے ہیں حالانکہ آپ بزرگوں کی مثال سامنے تھی کہ باطل نظریات اور افکار سے آپ کا کیا معاملہ ہے خدا جانے لیکن طواغیت اور ملحدین سے آپ کی خوب چھنتی ہے اور ان کے اندر اپنا اچھا امیج بنا رکھا ہے اور اس سلسلہ میں پیش قدمی برابر جاری ہے!!

فریدی صاحب فرماتے ہیں:

''ان کی چوتھی غلطی یہ ہے کہ شہادت حق اور اس کے مراحل متعین کرتے وقت قرآن وسنت کا براہ راست

مطالعہ نہیں کرتے بلکہ اپنی پسند کی شخصیت کی رائے اور تعبیر کو حتمی قرار دیتے ہیں ان کا مطالعۂ قرآن ناقص ہے، سیرتِ نبوی ﷺ کا علم سطحی اور یک رخا ہے۔''

بالکل بجا فرمایا آپ نے، لیکن بتایئے کہ یہاں صوبائی اور ضلع واری ذمہ داریاں نیز مرکزی سکریٹریٹ میں کون کونسی شخصیات براہ راست کتاب وسنت کا مطالعہ کرسکتی ہیں۔ براہ راست مطالعہ کرنے والے ہوتے تو آج تحریک اسلامی تذبذب کے دلدل میں نہیں پھنسی ہوتی۔ اس کے برخلاف براہ راست مطالعہ کرنے والی نوجوانوں کی پسندیدہ شخصیات مولانا مودودیؒ، مولانا ابواللیث ندوی اصلاحیؒ اور مولانا صدرالدین اصلاحیؒ کو ٹھکرا کر پالیسی بنائی جارہی ہے اور کہا جارہا ہے کہ ان کی تفسیر حتمی نہیں ہے ہم کو بھی اجتہاد کا حق ہے۔ پالیسی ساز لوگوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جو بقول فریدی صاحب قرآن کے ساتھ کھلواڑ کرتے ہیں۔ ''زندگی نو'' میں ۱۲ سال سے کمال بے حیائی اور جسارت کے ساتھ مولانا صدرالدین اصلاحیؒ جیسی شخصیت کا نام لے کر جھوٹا پروپگنڈہ کیا جاتا ہے کہ وہ بھی ہمارے ساتھ ہیں۔ جس کا بھانڈا موصوف کی وضاحت زندگی نو سے پھوٹ چکا ہے اور یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس نے مرکزی ساری کارروائیوں کو غیر معتبر بنا دیا ہے۔

مولانا مودودیؒ کے خلاف مستقل مہم چلائی جارہی ہے نمونہ کے لئے ''زندگی نو'' میں کسی نام کے مفتی صاحب نے مولانا مودودیؒ کے لٹریچر کو دعوت حق کی راہ میں حائل بتایا ہے وہ مضمون اجتماع ارکان بہار میں مرکزی ذمہ داروں کی موجودگی میں پڑھا گیا۔ جماعت کے خاص آرگن میں چھپا ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے؟

فریدی صاحب لکھتے ہیں:

''اگر وہ انبیاء علیہم السلام کی سیرت کو قرآن کی نظر سے دیکھتے تو ان پر یہ حقیقت عیاں ہوجاتی کہ ان میں سے اکثر کی پوری زندگی محض انداز وتبشیر میں گزر گئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی محض دعوت وتبلیغ سے عبارت تھی ان سب کا مفہوم یہ ہے مبارزت نہیں بلکہ دعوت اسلام کی اصل اور بنیادی حقیقت ہے۔''

دعوتِ اسلام کی اصل اور بنیادی حقیقت ہے تو جماعت اسلامی کا بنیادی نصب العین اقامت دین آپ نے کیسے بنالیا ہے؟ پھر دعوت کس چیز کی، سیکولر جمہوریت کی یا توحید خالص کی؟؟ یہ سوال اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ قیام دین کی دعوت کے بجائے آپ کی مہم سیکولر جمہوریت کی بقاء اور قیام کے لئے ہے۔ نظریۂ اقامت دین پر وحید الدین خاں اور شمس پیرزادہ وغیرہ کی تنقیدوں کے نتیجہ میں نظریۂ اقامت دین سے انحراف کرچکے ہیں تو دیانتداری کا تقاضا ہے کہ کھل کر توبہ کا اعلان کیجئے اور مولانا مودودیؒ کی کتابوں کے ذریعہ لاکھوں کا منافع جو حاصل ہورہا ہے اس سے دستبردار ہوجایئے۔

انبیاء کرام علیہم السلام میں اکثر کی پوری زندگی محض انداز وتبشیر میں گزری تو اس آیت کا کیا مطلب ہے۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ فَمَا وَهَنُوْا لِمَاۤ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا (آل عمران:۱۴۶)

پھر دیکھئے۔ کیا موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں مبارزت کا کوئی سراغ آپ کو نہیں ملا۔ فرعون سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کشمکش نہیں کی۔ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام چپکے سے مصر سے نکل گئے۔ پھر میدان تیہ میں بنی اسرائیل کو کس چیز کے لئے تیار کیا گیا ہے اور کیا حالات سے وہ گزرے؟

واقعہ یہ ہے کہ آپ کی جسارت قابل داد ہے صحیح کہا تھا کسی نے کہ جو لوگ مولانا مودودیؒ کا لٹریچر، تفہیم القرآن اور دستور جماعت اسلامی کو ہاتھ میں رکھتے ہوئے ووٹ دینے کا فیصلہ اور فورم برائے جمہوریت بنا سکتے ہیں اور کھلے طور پر سیکولرزم کے لئے مہم چلا سکتے ہیں اور مولانا صدر الدین اصلاحیؒ کی رائے کو غلط طور پر علی الاعلان بول سکتے ہیں وہ سب کچھ کر سکتے ہیں۔

فریدی صاحب فرماتے ہیں:

''ارشاد ہے کہ: اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تم بس ذکر کرتے جاؤ تمہارا مشن ہے کہ انسانوں کو پکارتے رہو اور جو اپنی خوشی سے تمہاری پکار پر لبیک کہے اس کا تزکیہ اور تربیت کرو زور زبردستی تمہارا کام نہیں ہے۔''

فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنتَ مُذَكِّرٌ لَّسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ (الغاشیۃ:۲۱،۲۲)

ہم عرض کریں گے کہ معاملہ اتنا آسان اور سرسری نہیں ہے بلکہ آپ کو بتانا ہوگا کہ اس آیت میں اور آیات جہاد وقتال میں بظاہر جو ٹکراؤ ہے اس کو کیسے دور کیا جائے گا۔

مثلاً: يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى الْقِتَالِ (الانفال:۶۵)

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ (الانفال:۳۹)

ایک اور رخ سے سوچئے کہ اگر تصادم، کشمکش کا معاملہ نہ ہوتا تو رسول اور مومنین ''مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ'' کیوں پکار اٹھے اور مومنین ''وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ'' کی دعا کیوں کرتے ہیں اور کس کے مقابلہ میں؟ اگر انبیاء علیہم السلام دعوت اور وعظ کا کام ہی کرتے تو انہیں دعوت دین کے ساتھ دعوت افطار بھی طاغوتوں کے یہاں ملتی اور پوری آؤ بھگت بھی ہوتی۔

فریدی صاحب فرماتے ہیں:

''ان نوجوانوں کی پانچویں غلطی یہ ہے کہ سرفروشی اور جہاد فی سبیل اللہ کے نہ معنی سے واقف ہیں اور نہ اس کے مراحل سے، وہ سمجھتے ہیں کہ دشمن کو زیر کرنے کیلئے مادی تدابیر بس جہاد کہلاتی ہیں اور اگر آج نہیں تو کل

صف آرائی کرنا پڑے گی یہ موقف جیسا کہ اوپر کی بحث سے واضح ہو گیا ہو گا نہ قرآن وسنت کے صحیح فہم پر مبنی ہے اور نہ اس کی دعوتی اور تحریکی حکمت عملی کا تقاضا ہے۔''

مشہور اور عام بات ہے کہ قرآن میں جہاں جہاں ''جہاد فی سبیل اللہ'' کا لفظ ہے سب جگہ میدانی لڑائی مراد ہے۔ دو درجن سے زیادہ جہادی مہم میں اللہ کے رسول ﷺ بذاتِ خود ہتھیار کے ساتھ شریک رہے ہیں اور درجنوں مہموں میں صرف صحابۂ کرامؓ گئے ہیں اور تلوار کے ساتھ گئے ہیں۔ کاغذ اور قلم ان کے ساتھ نہیں تھا۔ نہ میز کرسی اور نہ ٹیلیفون، نہ ریڈیو اور نہ ٹی وی۔ ایسی صورت میں جہاد کے معنی کیا متعین کئے جائیں۔ بتایئے؟ قرآن کہتا ہے۔

وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَّمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللهِ وَعَدُوَّكُمْ (الانفال:٦٠)

اس میں لفظ قوۃ کے سلسلہ میں قیل وقال کی گنجائش ہے مگر رباط الخیل کے مادی تدبیر ہونے میں کوئی شبہ ہے؟ پھر دشمن کو ڈرانا اور مرعوب کرنا مادی تدبیر اور مادی ذرائع کے بغیر ہو سکتا ہے؟ دشمن کو معلوم ہو جائے کہ آپ کے پاس صرف کوئی ڈگری ہے۔ آپ کئی مضامین میں ماہر ہیں۔ بڑے کاروبار کے مالک ہیں مگر توپ اور بندوق تو کیا لاٹھی ڈنڈا بھی نہیں رکھتے اور نہ اس کے قائل ہیں تو کیا دشمن کو آپ ڈرا سکیں گے اور کیا دشمن آپ کی کوئی پرواہ کرے گا؟

فریدی صاحب فرماتے ہیں:

''اس کے علاوہ یہ نوجوان یہ بھی نظر انداز کرتے ہیں کہ فقہاء نے اپنی تحقیقات میں شریعت اسلامی کے جو عمومی مقاصد متعین کئے ہیں ان میں انسانی جان، مال اور عزت وآبرو کا تحفظ نہایت اہم مقام رکھتے ہیں۔''

فریدی صاحب کو معلوم ہونا چاہئے کہ ان مقاصد کے حصول کے ہی لئے جذبۂ سرفروشی ضروری ہے اور اسلامی جہاد کا مقصد ہی فساد اور بدامنی کو ختم کرنا اور انسانی جان ومال اور عزت وآبرو کی حفاظت ہے اور اسی کیلئے برائی اور برے لوگوں کی سرکوبی ضروری ہوتی ہے زمانہ کے ابولہب اور ابوجہل اسی طرح وقت کے بنونضیر بنوقریظہ کو جب تک اکھاڑ نہیں پھینکا جائے گا اس وقت تک انسانی جان ومال کی حفاظت نہیں کی جا سکتی۔ اسی لئے فقہاء نے جہاں ان مقاصد کی نشاندہی کی ہے وہیں جہاد کو فرض قرار دیا ہے۔ آپ کی تقریر بالکل ایسی ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ ملک کی ساری عدالتوں کو ختم کر دینا چاہئے اور جیلوں کو توڑ دینا چاہئے کہ یہ احترام آدمیت کا تقاضا ہے۔

فریدی صاحب فرماتے ہیں:

''وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ شرعی دلیل کے معنی کیا ہوتے ہیں؟''

آپ کی یہ بات صحیح ہوسکتی ہے لیکن آپ تو جانتے ہیں نا کہ شرعی دلیل کیا ہے۔ ذرا بتایئے۔ اقامت دین کے نام پر غیر الٰہی نظام کی بقاء اور تحفظ کی مہم چلانے کے لئے کس آیت یا حدیث سے استدلال فرمایا گیا ہے؟ تَحَاكُمُ إِلَى الطَّاغُوتِ کے جواز کے لئے کہاں سے شرعی دلیل لائے ہیں۔ عبارۃ النص، دلالۃ النص، اشارۃ النص اور اقتضاء النص کی روشنی میں ''زندگیٔ نو'' کے کس مضمون میں استدلال فرمایا ہے۔ ایک کافر کی قیادت اور غیر اسلامی دستور کی روشنی میں وطن عزیز کی تعمیر کے لئے کوئی فورم بنانے کے لئے کونسی شرعی دلیل ہے؟؟

فریدی صاحب فرماتے ہیں:

''رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو صف آرائی کا حکم عامۃ الناس کے خلاف نہیں بلکہ شر اور طاغوت کے زعماء کے خلاف دیا گیا تھا جن پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قول، عمل اور کردار سے اتمام حجت کر دیا تھا۔''

ٹھیک ہے آپ نے تسلیم تو کیا کہ صف آرائی کا حکم دیا گیا تھا۔ یہ تو بتایئے کہ کون سے نوجوان عامۃ الناس کے خلاف صف آرائی کی بات کرتے ہیں کوئی حوالہ ہو تو پیش کیجئے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی بتایئے کہ ہندوستان میں ایسے زعماء نہیں ہیں جن کے خلاف صف آرائی کی ضرورت ہو؟ مثلاً بابری مسجد کو منہدم کرنے والوں کو آپ کس خانہ میں رکھتے ہیں۔ ان کے خلاف آپ کیوں نہیں صف آرائی کرتے۔ مسجد کی حفاظت کے لئے صف آرائی نہ کرنے کا آپ کے پاس کیا جواز ہے اور اس جواز کو آپ نے کس فقہی اصول کے ساتھ اخذ کیا ہے؟

فریدی صاحب فرماتے ہیں:

''حریت عقیدہ اسلام کے نزدیک محترم ہے لہٰذا اس کا احترام مطلوب ہو اور محمود بھی، اس کو بدلنے کے لئے صرف وہ کوشش صحیح ہوگی جو رائے عامہ کی ہمواری کے راستہ سے کی جائے۔''

اسلام کے نزدیک صرف عقیدۂ توحید مطلوب اور محمود ہے، اس کے علاوہ مشرکانہ عقائد نا مطلوب اور غیر محمود ہیں۔ چونکہ بزور کسی کے عقیدہ کو نہیں بدلا جاسکتا اس لئے عقیدۂ توحید کے علاوہ دوسرے عقائد کو بادل نخواستہ گوارا اور برداشت کیا جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ یہاں ایک بات اور بھی واضح رہنی چاہئے کہ اسلام کا پہلا مقصد مشرکانہ عقائد سے لوگوں کو پاک کرنا ہے جس کیلئے موعظِ حسنہ اور جدال احسن سے کام لینے کی تعلیم دی گئی ہے اور دوسرا مقصد مشرکانہ عقائد رکھنے والوں کو زیر کرنا اور مغلوب کرنا ہے اور ان کی جگہ عقیدۂ توحید کے حاملین کو غالب کرنا ہے۔ اسی کو قرآن کی اصطلاح میں اقامت دین، اظہار دین اور تمکین فی الارض کہتے ہیں۔ کیا اس دوسرے مقصد کا آپ انکار کر سکتے ہیں اگر نہیں انکار کر سکتے تو صرف رائے عامہ کی ہمواری کی بات ہی کو صحیح کیسے قرار دیتے ہیں جبکہ قرآن نے اس کے علاوہ بھی راستہ بتایا ہے؟؟